بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6892

سورۃ الملک (67)

آیت نمبر (1 تا 5)

ط	ب	ق

(س) طَبَقًا بادل کا فضا کو ڈھانپ لینا۔ عمارت کی منزل کے اوپر اور منزل ہونا۔
طَبَقٌ اسم ذات بھی ہے۔ کسی چیز کے اوپر کی چیز۔ منزل کے اوپر کی منزل۔ ﴿ لَتَرۡكَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ ﴾ (84/الانشقاق:19) ''تم لوگ لازماً چڑھو گے ایک منزل پر ایک منزل سے۔''

(مفاعلہ) طِبَاقًا مُطَابَقَةً (۱) ایک چیز کا دوسری کے مطابق ہونا۔ (۲) ایک جیسی چیزوں کا ایک دوسرے کے اوپر ہونا۔ زیر مطالعہ آیت۔3

ترجمہ

تَبٰرَكَ الَّذِیۡ	بِیَدِهِ	الۡمُلۡكُ ۫	وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیۡءٍ	قَدِیۡرُ ۙ﴿۱﴾
بابرکت ہوئی وہ (ذات)	جس کے ہاتھ میں	ساری بادشاہت ہے	اور وہ ہر چیز پر	قدرت رکھنے والا ہے

الَّذِیۡ خَلَقَ	الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوةَ	لِیَبۡلُوَكُمۡ	اَیُّكُمۡ اَحۡسَنُ
جس نے پیدا کیا	موت کو اور حیات کو	تاکہ وہ جانچے تم لوگوں کو (کہ)	تم لوگوں کا کون زیادہ اچھا ہے

عَمَلًا ؕ	وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ﴿۲﴾	الَّذِیۡ خَلَقَ	سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ	طِبَاقًا ؕ
بلحاظ عمل کے	اور وہ ہی بالادست ہے بے انتہا بخشنے والا ہے	جس نے پیدا کیا	سات آسمانوں کو	تلے اوپر ہوتے ہوئے

مَا تَرٰى	فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ	مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ	فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ
تو نہیں دیکھے گا	رحمان کی تخلق میں	کسی طرح بھی ہم آہنگ نہ ہونا	پس تو لوٹا بصارت کو

هَلۡ تَرٰى	مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾	ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ	كَرَّتَیۡنِ	یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡكَ الۡبَصَرُ
کیا تو دیکھتا ہے	کچھ بھی شگاف	پھر تو لوٹا بصارت کو	دوبارہ	تو پلٹ آئے گی تیری طرف بصارت

خَاسِئًا	وَّهُوَ حَسِیۡرٌ ﴿۴﴾	وَلَقَدۡ زَیَّنَّا	السَّمَآءَ الدُّنۡیَا	بِمَصَابِیۡحَ
تھکی ماندی ہوتے ہوئے	اس حال میں کہ وہ ناکام ہوگی	اور بیشک ہم نے سجایا ہے	نزدیکی (دنیوی) آسمان کو	چراغوں سے

وَجَعَلۡنٰهَا	رُجُوۡمًا	لِّلشَّیٰطِیۡنِ	وَاَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ	عَذَابَ السَّعِیۡرِ ﴿۵﴾
اور ہم نے بنایا ان (چراغوں) کو	سنگسار کرنے کے ذرائع	شیطانوں کے لیے	اور ہم نے تیار کیا ان کے لیے	بھڑکتی آگ کا عذاب

نوٹ:1

حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ سورۃ عذاب کو روکنے والی اور عذاب سے نجات دلانے والی ہے۔ یہ اپنے پڑھنے والے کو عذاب قبر سے بچائے گی۔ (معارف القرآن) 1892

نوٹ:2

آیت۔2 میں ہے کہ اس نے پیدا کیا موت اور حیات کو۔ حیات کے لیے پیدا کرنے کا لفظ تو اپنی جگہ ظاہر ہے، کہ حیات ایک وجودی چیز ہے۔ لیکن موت جو بظاہر ایک عدم کا نام ہے، اس کے ساتھ تخلیق کا تعلق کس طرح ہوا۔ اس کے جواب میں ائمہ تفسیر سے متعدد اقوال منقول ہیں۔ سب سے زیادہ واضح بات یہ ہے کہ موت عدم محض کا نام نہیں ہے بلکہ روح اور بدن کا تعلق منقطع کر کے روح کو ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل کرنے کا نام ہے اور یہ ایک وجودی چیز ہے۔ غرض جس طرح حیات ایک حال (یعنی حالت) ہے جو جسم انسانی پر طاری ہوتا ہے، اسی طرح موت بھی ایک ایسا ہی حال ہے۔ (معارف القرآن)

اس دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اس نے اس لیے شروع کیا ہے کہ ان کا امتحان لے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔ اس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ موت اور حیات اسی کی طرف سے ہے، کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔ دوسرے یہ کہ انسان جیسی مخلوق، جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے، اس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ موت۔ خالق نے اسے یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ زندگی اس کے لیے امتحان کی مہلت ہے اور موت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ اسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے تا کہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا برائی کا اظہار کر سکے۔ چوتھے یہ کہ خالق ہی اس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا بُرا۔ اعمال کی اچھائی اور برائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والوں کا کام نہیں ہے بلکہ امتحان لینے والے کا کام ہے۔ اس لیے جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے اسے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ امتحان لینے والے کے نزدیک حسنِ عمل کیا ہے۔ پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ جس کا جیسا عمل ہوگا اسی کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

(آیت 5۔7) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہی تارے شیطانوں پر پھینک مارے جاتے ہیں اور یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ شہاب ثاقب صرف شیطانوں کو مارنے ہی کے لیے گراتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تاروں سے جو بے حد و حساب شہابِ ثاقب نکل کر کائنات میں انتہائی تیز رفتاری سے گھومتے رہتے ہیں اور جن کی بارش زمین پر بھی ہر وقت ہوتی رہتی ہے، وہ اس امر میں مانع ہے کہ زمین کے شیاطین عالم بالا میں جا سکیں۔ اگر وہ اوپر جانے کی کوشش کریں بھی تو یہ شہابِ ثاقب انہیں مار بھگاتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ ان شہابیوں کی حقیقت کیا ہے، تو اس بارے میں انسان کی معلومات اس وقت تک کسی قطعی تحقیق سے قاصر ہیں۔ تاہم جس قدر بھی حقائق اور واقعات اب تک انسان کے علم میں آئے ہیں اور زمین پر گرے ہوئے شہابیوں کے معائنے سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں ان کے بناء پر سائنس دانوں میں سب سے زیادہ مقبول نظریہ یہی ہے کہ یہ شہابیے کسی سیارے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلا میں گھومتے رہتے ہیں اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آ کر ادھر کا رخ کر لیتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (6تا14)

ترکیب

(آیت۔7۔8) اِذَا اور کُلَّمَا حرف شرط ہیں۔ اس لیے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ تَمَیَّزُ کی پہچان یہ ہے کہ نہ تو یہ تَمَیَّزَ (باب تفعل کا ماضی) ہے اور نہ ہی یہ تُمَیِّزُ (باب تفعیل کا مضارع) ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ باب تفعّل کا مضارع تَتَمَیَّزُ ہے جس کی ایک تا گری ہوئی ہے۔ خَازِنٌ کی جمع خَزَنَةٌ ہے۔ یہاں یہ سَئَلَ کا فاعل اسم ظاہر ہے اس لیے فاعل جمع ہونے کے باوجود فعل سَئَلَ واحد آیا ہے (آیت۔9) قَالُوْا سے پہلے کوئی حرف شرط نہیں ہے لیکن پھر بھی فعل ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا کیونکہ یہ قیامت کا بیان ہے۔ (دیکھیں آیت۔2۔27، نوٹ 3)۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ میں اِنْ کی بعد اِلَّا آ رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اِنْ نافیہ

ہے۔(آیت۔10)اس آیت کے مختلف ترجمے ممکن ہیں۔لَوْ کو شرطیہ(اگر)مان کر بھی ترجمہ ہوسکتا ہے اور اسے تمنی(کاش)مان کر بھی ترجمہ ہوسکتا ہے۔دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔اسی طرح کُنَّا نَسْمَعُ کو ماضی استمراری بھی مانا جاسکتا ہے اور کُنَّا کو فعل ناقص مان لیں تو اس میں شامل نَحْنُ کی ضمیر اس کا اسم اور نَسْمَعُ اس کی خبر ہوگی۔دونوں ترجمے درست ہوں گے۔(آیت۔11)سُحْقًا کسی فعل محذوف کا مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔(آیت۔14)اس کے بھی دو ترجمے ممکن ہیں،ایک یہ کہ اَلَا کو حرف تنبیہ(خبردار۔سن لو)مان کر ترجمہ کیا جائے۔دوسرے یہ کہ ہمزہ کو استفہامیہ(کیا)مان کر اور لَا یَعْلَمُ کو فعل نفی مان کر ترجمہ کیا جائے۔دونوں ترجمے درست ہوں گے۔

ترجمہ

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا	بِرَبِّهِمْ	عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ	وَبِئْسَ	الْمَصِيْرُ ۝۶
اوران کے لیے جنہوں نے انکار کیا	اپنے رب کا	جہنم کا عذاب ہے	اور بہت بری ہے(وہ)	لوٹنے کی جگہ

اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا	سَمِعُوْا لَهَا	شَهِيْقًا	وَّهِيَ تَفُوْرُ ۝۷	تَكَادُ تَمَيَّزُ
جب وہ ڈالے جائیں گے اس میں	تو وہ سنیں گے اس میں	رینکنے والی آواز	اس حال میں کہ وہ ابلتی ہوگی	قریب ہے کہ وہ پھٹ پڑے گی

مِنَ الْغَيْظِ ؕ	كُلَّمَآ	اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ	سَاَلَهُمْ	خَزَنَتُهَآ	اَلَمْ يَاْتِكُمْ
شدید غصہ سے	جب کبھی بھی	ڈالا جائے گا اس میں کسی گروہ کو	تو پوچھیں گے ان سے	اس(جہنم)کے داروغہ لوگ	کیا نہیں پہنچا تمہارے پاس

نَذِيْرٌ ۝۸	قَالُوْا بَلٰى	قَدْ جَآءَنَا	نَذِيْرٌ ۙ	فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا
کوئی خبردار کرنے والا	وہ لوگ کہیں گے کیوں نہیں	آچکا تھا ہمارے پاس	ایک خبردار کرنے والا	تو ہم نے جھٹلایا اور ہم نے کہا

مَا نَزَّلَ اللّٰهُ	مِنْ شَيْءٍ ۚ	اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا	فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝۹
نہیں اتاری اللہ نے	کوئی بھی چیز	نہیں ہو تم(خبردار کرنے والے)لوگ مگر	ایک بڑی گمراہی میں

وَقَالُوْا	لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ	اَوْ نَعْقِلُ	مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۰
اور وہ(جہنمی)لوگ کہیں گے	کاش ہم سنا کرتے	یا عقل استعمال کیا کرتے	تو ہم نہ ہوتے آگ والوں میں

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ	فَسُحْقًا	لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۱	اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
پھر وہ لوگ اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا	(تو ثابت ہوگی)دوری(رحمت سے)	آگ والوں کے لیے	بیشک جو لوگ مرعوب رہتے ہیں اپنے رب سے

بِالْغَيْبِ	لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ	وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۲	وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ	اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ	اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ
اَن دیکھے میں	ان کے لیے مغفرت ہے	اور بڑا اجر ہے	اور تم لوگ چھپاؤ اپنی بات کو	یا نمایاں کرو اس کو	بیشک وہ(تو)جاننے والا ہے

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾	اَ	لَا يَعْلَمُ	مَنْ خَلَقَ ؕ	وَهُوَ اللَّطِيْفُ	الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾
سینوں والی (بات) کو (بھی)	کیا	نہیں جانے گا	وہ جس نے پیدا کیا	درآنحالیکہ وہی باریک بین ہے	باخبر ہے

6892

نوٹ: 1

آیت۔7 میں شَهِيْقٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو گدھے کی سی آواز کے لیے بولا جاتا ہے۔اس فقرے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ خود جہنم کی آواز ہوگی، اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ آواز جہنم سے آ رہی ہوگی جہاں ان سے پہلے گرے ہوتے لوگ چیخیں مار رہے ہوں گے۔اس دوسرے مفہوم کی تائید سورۃ ہودؑ کی آیت۔106 سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں یہ دوزخی لوگ ہانپیں گے اور پھنکاریں گے اور پہلے مفہوم کی تائید سورۂ فرقان کی آیت۔12۔ سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ دوزخ میں جاتے ہوئے یہ لوگ دور ہی سے اس کے غضب اور جوش کی آوازیں سنیں گے۔اس بنا پر صحیح یہ ہے کہ شور خود جہنم کا بھی ہوگا اور جہنمیوں کا بھی۔(تفہیم القرآن)

آیت نمبر (15 تا 22)

ترکیب

(آیت۔15) رِزْقِهٖ کی ضمیر هُوَ الَّذِیْ کے لیے ہے۔اگر اَلْاَرْضَ کے لیے ہوتی تو رِزْقَهَا آتا۔(آیت۔17۔18) نَذِيْرِ اور نَكِيْرِ کی ر پر کسرہ بتا رہی ہے کہ ان کے آگے یائے متکلم محذوف ہیں اور یہ دراصل نَذِيْرِیْ اور نَكِيْرِیْ ہیں (آیت۔20) اَمَّنْ دراصل اَمْ مَنْ ہے جس کو ملا کر لکھا گیا ہے۔(آیت۔21) اَمْسَكَ میں شامل هُوَ کی ضمیر کو اگر قریبی مرجع هٰذَا الَّذِیْ کے لیے مانیں تو جملہ بے معنی ہو جاتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضمیر اَلرَّحْمٰن کے لیے ہے۔(آیت۔22) يَمْشِیْ فعل لازم ہے۔اس لیے مُكِبًّا اور سَوِيًّا اس کے مفعول نہیں ہو سکتے بلکہ یہ حال ہیں۔

ترجمہ

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ	ذَلُوْلًا	فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا
وہ، وہ ہے جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو	رام (تابعدار) کی ہوئی	پس تم لوگ چلو اس کے کندھوں (راستوں) میں

وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ	وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾	ءَاَمِنْتُمْ	مَّنْ فِی السَّمَآءِ
اور کھاؤ اس (اللہ) کے رزق میں سے	اور اس ہی کی طرف دوبارہ اٹھنا ہے	کیا تم لوگ امن میں (نڈر) ہو گئے	اُس سے جو آسمان میں ہے

اَنْ يَّخْسِفَ	بِكُمُ الْاَرْضَ	فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾	اَمْ اَمِنْتُمْ
(اس سے) کہ وہ دھنسا دے	تمہارے ساتھ زمین کو	پھر جب ہی وہ کپکپاتی ہو	یا تم لوگ امن میں ہو گئے

مَّنْ فِی السَّمَآءِ	اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ	حَاصِبًا ؕ	فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ	نَذِيْرِ ﴿۱۷﴾
اُس سے جو آسمان میں ہے	کہ وہ بھیج دے تم لوگوں پر	کنکریاں مارنے والی تند ہوا	پھر تم جان لوگے (کہ) کیسا تھا	میرا خبردار کرنے والا

وَلَقَدْ كَذَّبَ	الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	فَكَيْفَ كَانَ	نَكِيْرِ ﴿۱۸﴾
اور بیشک جھٹلا چکے ہیں	وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے	تو (دیکھو کہ) کیسا تھا	میرا عدم عرفان

اَوَلَمْ يَرَوْا	اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ	صٰٓفّٰتٍ	وَّيَقْبِضْنَ ۛ	مَا يُمْسِكُهُنَّ
اور کیا انہوں نے غور ہی نہیں کیا	پرندوں کی طرف اپنے اوپر	صف بچھانے (پھیلانے) والے ہوتے ہوئے	اور سمیٹتے ہوئے	نہیں تھامتا ان کو (کوئی)

اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ	اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیۡءٍۭ	بَصِیۡرٌ ﴿۱۹﴾	اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ	هُوَ جُنۡدٌ لَّكُمۡ
سوائے رحمٰن کے	بیشک وہ ہر چیز کو	دیکھنے والا ہے	یا کون یہ ہے جو (کہ)	وہ ہو ایسا لشکر تمہارے لیے

یَنۡصُرُكُمۡ	مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ ؕ	اِنِ الۡكٰفِرُوۡنَ	اِلَّا فِیۡ غُرُوۡرٍ ﴿۲۰﴾
جو مدد کرے تمہاری	رحمٰن کے بجائے	نہیں ہیں کافر لوگ	مگر کچھ فریبوں میں (مبتلا)

اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ	یَرۡزُقُكُمۡ	اِنۡ اَمۡسَكَ رِزۡقَهٗ ۚ	بَلۡ لَّجُّوۡا	فِیۡ عُتُوٍّ
یا کون یہ ہے جو	روزی دے تم کو	اگر وہ (رحمٰن) روک لے اپنا رزق	بلکہ وہ لوگ اڑے رہے	سرکشی کرنے میں

وَّنُفُوۡرٍ ﴿۲۱﴾	اَفَمَنۡ یَّمۡشِیۡ	مُكِبًّا	عَلٰی وَجۡهِهٖۤ
اور بیزاریوں میں	تو کیا وہ جو چلتا ہے	اوندھا کرنے والا ہوتے ہوئے (خود کو)	اپنے چہرے کے بل

اَهۡدٰۤی	اَمَّنۡ یَّمۡشِیۡ	سَوِیًّا	عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۲﴾
زیادہ ہدایت پر ہے	یا وہ چلتا ہے	کامل (سیدھا) ہوتے ہوئے	ایک سیدھے راستے پر

نوٹ:1

فرمایا کہ زمین کو تمہارے لیے ہم نے ایسا مطیع بنا دیا کہ تم اس کے مونڈھوں (کندھوں) پر چڑھتے پھرو۔ مطلب یہ ہے کہ زمین کو حق تعالیٰ نے ایک ایسا قوام (مادہ) بخشا ہے کہ نہ تو پانی کی طرح بہنے والا ہے، نہ روئی اور کیچڑ کی طرح دبنے والا، کیونکہ زمین ایسی ہوتی تو اس پر کسی انسان کا ٹھہرنا ناممکن ہوتا۔ اسی طرح زمین کو لوہے یا پتھر کی طرح سخت بھی نہیں بنایا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس میں درخت اور کھیتی نہ بوئی جا سکتی، کنویں اور نہریں نہ کھودی جا سکتیں اور اس کو کھود کر اونچی عمارتوں کی بنیاد نہ رکھی جا سکتی۔ اس قوام (نرم مادے) کے ساتھ اس کو ایسا سکون بخشا کہ اس پر عمارتیں ٹھہر سکیں اور چلنے پھرنے والوں کو لغزش نہ ہو۔ (معارف القرآن)

نوٹ:2

مَنۡ فِی السَّمَآءِ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں رہتا ہے بلکہ یہ بات اس لحاظ سے فرمائی گئی ہے کہ انسان فطری طور پر جب خدا سے رجوع کرنا چاہتا ہے تو آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ دعا مانگتا ہے تو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتابوں کو کتب سماوی کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات کچھ انسان کی فطرت ہی میں ہے کہ وہ جب خدا کا تصور کرتا ہے تو اس کا ذہن آسمان کی طرف جاتا ہے۔ اسی بات کو ملحوظ رکھ کے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہاں مَنۡ فِی السَّمَآءِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس میں اس شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کو آسمان میں مقیم قرار دیتا ہے۔ یہ شبہ آخر کیسے پیدا ہو سکتا ہے جب کہ اسی سورۂ ملک کے آغاز میں فرمایا جا چکا ہے کہ جس نے تہہ بہ تہہ سات آسمان پیدا کیے اور سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ (پس تم جدھر بھی رخ کرو اُس طرف اللہ کا رخ ہے) (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیت۔22۔ میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ ان لوگوں پر ہدایت کی راہ کیوں نہیں کھل رہی ہے اور سمجھانے کے باوجود یہ گمراہی میں بھٹک رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔ جس طرح کتا زمین کو سونگتا ہوا چلتا ہے کہ شائد کوئی چیز کھانے کی مل جائے۔ اسی طرح ان لوگوں کی رہنما بھی عقل کے بجائے ان کی خواہش ہے اور یہ سر جھکائے، آنکھیں بند کیے اپنی خواہش کے پیچھے چل رہے ہیں۔ خواہش کے پیچھے چلنے والا کبھی ہدایت کی راہ نہیں پا سکتا۔ ہدایت کی راہ اس کو ملتی ہے جو سیدھی راہ پر سر اٹھا کر دہنے بائیں اور آگے پیچھے کا جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے انسان کو مستوی القامت پیدا کیا، جانوروں کی طرح زمین کی طرف جھکا ہوا نہیں پیدا کیا۔ لیکن بہت سے انسان جانوروں ہی کی روش کی تقلید کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اس اعلیٰ خصوصیت کو کھو بیٹھتے ہیں جو انسان کا اصلی شرف ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ

رہے کہ خواہش کے پیچھے چلنے والوں کی مثال قرآن میں جگہ جگہ جانوروں سے دی گئی ہے۔ (تدبر قرآن) 6892

آیت نمبر (23 تا 30)

ترجمہ

قُلْ	هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ	وَجَعَلَ لَكُمُ	السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ
آپؐ کہیے	وہ، وہ ہے جس نے اٹھایا تم لوگوں کو	اور بنائے تمہارے لیے	سماعت اور بصارتیں اور دل

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿٢٣﴾	قُلْ هُوَ الَّذِيْ	ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ	وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٢٤﴾
بہت تھوڑا تم لوگ شکر کرتے ہو	آپؐ کہیے وہ، وہ ہے جس نے	بکھیرا تم لوگوں کو زمین میں	اور اس کی طرف ہی تم لوگ اکٹھا کیے جاؤ گے

وَيَقُوْلُوْنَ	مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ	اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٥﴾	قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ
اور یہ لوگ کہتے ہیں	کب ہے یہ وعدہ	اگر تم لوگ سچے ہو	آپؐ کہیے اور علم تو بس

عِنْدَ اللّٰهِ ۖ	وَاِنَّمَآ اَنَا	نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢٦﴾
اللہ کے پاس ہے	اور میں تو صرف	ایک کھلا کھلا خبردار کرنے والا ہوں

فَلَمَّا رَاَوْهُ	زُلْفَةً	سِيْٓـَٔتْ
پھر جب وہ دیکھیں گے اُس (وعدہ) کو	قریب میں	تو بگاڑے جائیں گے

وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ	كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿٢٧﴾	قُلْ اَرَءَيْتُمْ
ان لوگوں کے چہرے جنہوں نے کفر کیا	اور کہا جائے گا یہ ہے وہ	تم لوگ جس کو مانگا کرتے تھے	آپؐ کہیے کیا تم لوگوں نے غور کیا

اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ	وَمَنْ مَّعِيَ	اَوْ رَحِمَنَا ۙ	فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ
اگر ہلاک کر دے مجھ کو اللہ	اور ان کو (بھی) جو میرے ساتھ ہیں	یا رحم کرے ہم پر	تو کون بچائے گا کافروں کو

مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾	قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ	اٰمَنَّا بِهٖ	وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ
ایک دردناک عذاب سے	آپؐ کہیے وہی رحمٰن ہے	ہم ایمان لائے جس پر	اور اس پر ہی ہم نے بھروسہ کیا

فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ	فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢٩﴾	قُلْ اَرَءَيْتُمْ
پس تم لوگ جان لوگے کون وہ ہے جو	ایک کھلی گمراہی میں ہے	آپؐ کہیے کیا تم لوگوں نے غور کیا

اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ	غَوْرًا	فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ	بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿٣٠﴾ ع
اگر ہو جائے تمہارا پانی	زمین میں جذب	تو کون لائے گا تمہارے پاس	کچھ رواں پانی

نوٹ:1

آیت۔23۔ میں اعضاء انسانی میں اُن تین اعضاء کا ذکر ہے جن پر علم وادراک اور شعور موقوف ہے۔ فلاسفہ نے علم وادراک کے پانچ ذریعے بیان کیے ہیں جن کو حواس خمسہ کہا جاتا ہے۔ ان پانچ چیزوں میں سے صرف دو کا ذکر کیا ہے یعنی کان اور آنکھ۔ وجہ یہ ہے کہ سونگھنے، چکھنے اور چھونے سے بہت کم چیزوں کا علم انسان کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کی معلومات کا بڑا مدار سننے اور دیکھنے پر ہے۔ اور ان میں بھی سننے کو مقدم کیا گیا ہے۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ انسان کو اپنی عمر میں جتنی معلومات ہوتی ہیں ان میں سنی ہوئی چیزیں بہ نسبت دیکھی ہوئی چیزوں کے بدرجہا زائد ہوتی ہیں۔ بیشتر معلومات انسانی انہیں دو راہوں سے حاصل ہوتی ہیں اور تیسری چیز قلب پر موقوف ہے۔ جبکہ فلاسفہ (یعنی فلسفی لوگ) دماغ کو اس کا مرکز مانتے ہیں۔ (معارف القرآن)۔

حواس خمسہ سے حاصل شدہ معلومات کے ضمن میں دماغ یعنی عقل اور دل، دونوں کا اپنا اپنا ایک رول ہے جس کی وضاحت آیت۔ 7/179، نوٹ۔2 میں کی جا چکی ہے۔ اسے دوبارہ دیکھ لیں۔ (مرتب)

نوٹ:2

آیت۔24۔ میں اس حقیقت کی یاددہانی کردی ہے کہ ایک کسان اپنے کھیت میں کوئی فصل بوتا ہے، اس کو کھاد اور پانی دیتا ہے، چرند و پرند سے اس کی حفاظت کرتا ہے تو ہر دیکھنے والا بن بتائے یہ جانتا ہے کہ ایک دن وہ اس کو کاٹے گا اور اس کے دانے اور بھس کو الگ الگ کرے گا۔ آخر یہ واضح حقیقت خدا کے متعلق تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ اگر تم عقل سے کام لو (آیت۔23 کے حوالے سے) تو یہ واضح حقیقت نہایت آسانی سے سمجھ میں آجانی چاہیے کہ جس خدا نے تم کو زمین میں بویا (پھیلایا) ہے اور تمہاری پرورش کر رہا ہے وہ تم کو یونہی نہیں چھوڑ رکھے گا، بلکہ وہ اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹ کر اپنے کھلیان میں جمع کرے گا۔ پھر اس کے دانے کو بھس سے الگ کرے گا اور اس کو کھتے میں جمع کر کے بھس کو جلادے گا۔ یہ امر واضح رہے کہ قرآن نے یہاں جو حقیقت نہایت سادہ لفظوں میں بیان کر دی ہے، قدیم صحیفوں خصوصاً انجیل میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:3

آخر سورۃ میں (آیت۔30) پھر ایک جملہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ زمین پر بسنے والو اور اس کو کھود کر کنویں بنانے والو اور اس کے پانی سے اپنے پینے پلانے اور نباتات اگانے کا کام لینے والو، اس بات کو مت بھولو کہ یہ سب چیزیں کوئی تمہاری ذائی جاگیر نہیں ہیں، بلکہ صرف حق تعالیٰ کا عطیہ ہیں۔ پانی اس نے برسایا، پانی کو برف کی شکل میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اس نے لاد دیا، پھر برف کو آہستہ آہستہ پگھلا کر پہاڑوں کے عروق کے ذریعہ زمین کے اندر اس نے اتارا اور بغیر کسی پائپ لائن کے پوری زمین میں اس کا ایسا جال پھیلا دیا کہ جہاں چاہو زمین کھود کر پانی نکال لو۔ مگر یہ پانی اس نے زمین کی اوپری سطح پر رکھا ہے جس کو چند فٹ یا چند گز زمین کھود کر نکالا جاسکتا ہے۔ یہ مالک و خالق کا عطیہ ہے اگر وہ چاہے تو اس پانی کو زمین کی نیچے کی سطح پر اتار دے جہاں تک تمہاری رسائی ممکن نہ ہو۔ تو تمہاری کون سی طاقت ہے جو اس جاری پانی کو حاصل کر سکے۔ حدیث میں ہے کہ جب آدمی اس آیت کی تلاوت کرے تو اس کو کہنا چاہیے اَللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْن۔ یعنی اللہ ہی پھر اس کو لاسکتا ہے، ہماری کسی کی طاقت نہیں۔ (معارف القرآن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6892

سورۃ القلم (68)

آیت نمبر (1 تا 16)

ترجمہ

نٓ	وَالۡقَلَمِ	وَمَا یَسۡطُرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾	مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ	بِمَجۡنُوۡنٍ ۚ﴿۲﴾
۔	قسم ہے قلم کی	اور اس کی جو وہ لکھتے ہیں	نہیں ہیں آپؐ اپنے رب کی نعمت کے سبب سے	کوئی مجنون

وَاِنَّ لَکَ	لَاَجۡرًا	غَیۡرَ مَمۡنُوۡنٍ ۚ﴿۳﴾	وَاِنَّکَ	لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ﴿۴﴾
اور بیشک آپؐ کے لیے	یقیناً ایک ایسا اجر ہے جو	منقطع ہونے والا نہیں ہے	اور بیشک آپؐ	یقیناً عظیم اخلاقیات پر ہیں

فَسَتُبۡصِرُ	وَیُبۡصِرُوۡنَ ۙ﴿۵﴾	بِاَیِّیۡکُمُ	الۡمَفۡتُوۡنُ ﴿۶﴾	اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ
پس آپؐ دیکھیں گے	اور یہ لوگ (بھی) دیکھ لیں گے	تمہارے کس کے ساتھ	مبتلاء فتنہ (شخص) ہے	بیشک آپؐ کا رب ہی خوب جاننے والا ہے

بِمَنۡ ضَلَّ	عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ۖ	وَہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۷﴾	فَلَا تُطِعِ الۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۸﴾
اس کو جو بھٹک گیا	اس کے راستے سے	اور وہ ہی خوب جاننے والا ہے ہدایت پانے والوں کو	تو آپؐ کہنا مت مانیں جھٹلانے والوں کا

وَدُّوۡا	لَوۡ تُدۡہِنُ	فَیُدۡہِنُوۡنَ ﴿۹﴾	وَلَا تُطِعۡ	کُلَّ حَلَّافٍ
ان لوگوں نے خواہش کی	کاش آپؐ ڈھیلے پڑیں	تو وہ لوگ بھی ڈھیلے پڑیں گے	تو آپؐ کہنا مت مانیں	کسی بھی بہت قسم کھانے والے کا

مَّہِیۡنٍ ۙ﴿۱۰﴾	ہَمَّازٍ	مَّشَّآءٍۭ	بِنَمِیۡمٍ ۙ﴿۱۱﴾	مَّنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ
کسی بے وقعت کا	کسی کثرت سے طعنہ دینے والے کا	بہت چغلی کھانے والا	چغلی کے ساتھ	بہت منع کرنے والا کسی بھی بھلائی سے

مُعۡتَدٍ	اَثِیۡمٍ ۙ﴿۱۲﴾	عُتُلٍّۭ	بَعۡدَ ذٰلِکَ	زَنِیۡمٍ ۙ﴿۱۳﴾	اَنۡ کَانَ
زیادتی کرنے والا	پکا گنہگار	بدمزاج	اس کے بعد (ساتھ)	بدذات بھی	(اس لیے) کہ وہ ہوا

ذَا مَالٍ وَّ بَنِیۡنَ ؕ﴿۱۴﴾	اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ	اٰیٰتُنَا	قَالَ
مال اور بیٹوں والا	جب بھی پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اس کو	ہماری آیتیں	تو وہ کہتا ہے

اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۵﴾	سَنَسِمُہٗ	عَلَی الۡخُرۡطُوۡمِ ﴿۱۶﴾
پہلے لوگوں کی داستانیں ہیں	ہم داغ دیں گے اس کو	سونڈ (ناک) پر

نوٹ: 1

رسول کریمؐ کے وجود میں حق تعالیٰ نے تمام ہی اخلاق فاضلہ بدرجہ کمال جمع فرما دیئے تھے۔ خود آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مجھے اس کام کے لیے بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال رسول اللہؐ کی خدمت کی اس پوری مدت میں جو کام میں نے کیا، آپؐ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کیا اور جو کام نہیں کیا اس پر کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں نہیں کیا۔ بی بی عائشہؓ فرماتی ہیں کہ

رسول اللہؐ نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا بجز جہاد فی سبیل اللہ کے۔ آپؐ نے نہ کسی خادم کو، نہ کسی عورت کو کبھی مارا۔ ان میں سے کسی سے خطا و لغزش بھی ہوئی تو اس کا انتقام نہیں لیا بجز اس کے کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہو تو شرعی سزا جاری فرمائی۔ آپؐ نہ فحش گو تھے نہ فحش کے پاس جاتے تھے، نہ بازار میں شور و شغب کرتے تھے۔ برائی کا بدلہ کبھی برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معافی اور درگزر کا معاملہ فرماتے تھے۔ اور حضرت ابودرداءؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میزانِ عمل میں خلق حسن کے برابر کسی عمل کا وزن نہیں ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ گالی گلوچ کرنے والے بدزبان سے بغض رکھتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مسلمان اپنے حسن خلق کی بدولت اس شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو ہمیشہ رات کو عبادت میں جاگتا اور دن بھر روزہ رکھتا ہو۔ اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ مجھے یمن کا عامل۔ (گورنر) مقرر کر کے بھیجنے کے وقت آخری وصیت جو آپؐ نے مجھے اس وقت فرمائی جبکہ میں اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا، وہ یہ تھی کہ اے معاذؓ لوگوں سے حسن خلق کا برتاؤ کرنا۔ (معارف القرآن)

نوٹ: 1 آیت۔10۔ کو سابقہ آیت فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ پر عطف کر کے تاکید کے ساتھ پھر تنبیہ فرمائی کہ تم ہر لپاٹیے ذلیل کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ اشارہ کسی خاص شخص کی طرف نہیں ہے بلکہ قریش کی پوری قیادت کی اخلاقی پستی کی تصویر آگے کی چند آیتوں میں کھینچ دی گئی ہے اور مقصود یہ دکھانا ہے کہ ایک طرف پیغمبر کا بے مثال خلقِ عظیم ہے اور دوسری طرف قریش کے لیڈروں کا یہ کردار ہے جو بینا ہو رہا ہے۔ ان دونوں کے سامنے رکھ کر ہر منصف مزاج فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون کس انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔

یہ بات کہ یہاں کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا کردار بیان ہو رہا ہے، مختلف پہلوؤں سے واضح ہے۔ (۱) اس کا عطف اَلْمُكَذِّبِيْنَ پر ہے اور مُكَذِّبِيْنَ سے مراد ظاہر ہے کہ کوئی متعین شخص نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت ہے۔ (۲) لفظ كُلَّ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کسی متعین شخص کا کردار زیر بحث نہیں ہے بلکہ جماعت کا کردار ہے۔ (۳) یہاں جو کردار بیان ہوا ہے وہ قریش کی پوری قیادت پر تو ٹھیک ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے لیکن ہر بات اگر کسی ایک شخص پر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے تو تکلف کرنا پڑے گا۔ (تدبر قرآن)

آیت نمبر (17 تا 33)

ص ر م

(ض) صَرْمًا (۱) کسی چیز کا ٹوٹنا (لازماً) کسی چیز کو کاٹنا (متعدی)۔ زیر مطالعہ آیت۔17۔

صَارِمٌ اسم الفاعل ہے۔ کاٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔22۔

صَرِيْمٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے اسم المفعول کے معنی میں۔ کاٹا ہوا۔ پھر اس فصل کے لیے بھی آتا ہے جو کاٹ لی گئی ہو اور اس زمین کے لیے بھی جس کی فصل کاٹ لی گئی ہو۔ زیر مطالعہ آیت۔20۔

ح ر د

(ض) حَرْدًا (۱) منع کرنا۔ (۲) ارادہ کرنا۔

حَرْدٌ اسم ذات بھی ہے۔ ارادہ۔ زیر مطالعہ آیت۔25۔

ترکیب

(آیت۔17) بَلَوْنٰهُمْ میں هُمْ کی ضمیر اہل مکہ کے لیے ہے۔ اَقْسَمُوْا میں شامل هُمْ کی ضمیر فاعلی اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ کے لیے ہے۔(آیت۔24) یہاں پر لَا يَدْخُلَنَّ کے دو امکانات ہیں۔ایک یہ کہ اس کو مضارع منفی مانا جائے جس پر نون ثقیلہ داخل ہوا ہے۔ایسی صورت میں ترجمہ ہوگا ''ہرگز داخل نہیں ہوگا۔'' دوسرا یہ کہ اس کو لائے نہی غائب لَا يَدْخُلْ مانا جائے جس پر نون ثقیلہ داخل ہوا ہے۔اس کا ترجمہ ہوگا ''چاہے کہ ہرگز داخل نہ ہو۔'' سیاق وسباق کے لحاظ سے دوسرے امکان کو ترجیح دینا بہتر ہے۔

ترجمہ

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ	كَمَا بَلَوْنَآ	اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ	اِذْ اَقْسَمُوْا
بیشک ہم نے آزمائش میں ڈالا ان کو	جیسے ہم نے آزمایا	باغ والوں کو	جب انہوں نے قسم کھائی

لَيَصْرِمُنَّهَا	مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۱۷﴾	وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾	فَطَافَ عَلَيْهَا
ہم لازماً کاٹیں گے اس (باغ کی فصل) کو	صبح کرنے والے ہوتے ہوئے	اور انہوں نے استثناء (ان شاء اللہ) نہیں کہا	تو گھوم گیا اس (باغ) پر

طَآئِفٌ	مِّنْ رَّبِّكَ	وَ	هُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾	فَاَصْبَحَتْ	كَالصَّرِيْمِ ۙ﴿۲۰﴾
ایک گھومنے والا (بگولہ)	آپؐ کے رب (کی طرف) سے	اس حال میں کہ	وہ لوگ نیند کرنے والے تھے	نتیجۃً وہ (باغ) صبح کو ہو گیا	کاٹے ہوئے کھیت کی مانند

فَتَنَادَوْا	مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۲۱﴾	اَنِ اغْدُوْا	عَلٰى حَرْثِكُمْ	اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾
تو انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا	صبح سویرے	کہ تم لوگ سویرے پہنچو	اپنی کھیتی پر	اگر تم لوگ ہو کاٹنے والے

فَانْطَلَقُوْا	وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۙ﴿۲۳﴾	اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا	الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ
تو وہ لوگ چلے	اور وہ لوگ باہم سرگوشی کرتے تھے	کہ چاہیے کہ ہرگز داخل نہ ہو اس (باغ) میں	آج تم پر

مِّسْكِيْنٌ ۙ﴿۲۴﴾	وَّغَدَوْا	عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾	فَلَمَّا رَاَوْهَا	قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۙ﴿۲۶﴾
کوئی مسکین	اور وہ سویرے نکلے	ایک ارادہ پر قادر ہوتے ہوئے	پھر جب انہوں نے دیکھا اس (باغ) کو	تو کہا بیشک ہم یقیناً راستہ بھولنے والے ہیں

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾	قَالَ اَوْسَطُهُمْ	اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ	لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾
(نہیں) بلکہ ہم محروم کیے گئے ہیں	کہا ان کے زیادہ افضل نے	کیا میں نے نہیں کہا تھا تم لوگوں سے	کہ تسبیح کیوں نہیں کرتے (اللہ کی)

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ	اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾	فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ	يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾
انہوں نے کہا ہمارے رب کی پاکیزگی ہے	بیشک ہم تھے ظلم کرنے والے	تو سامنے ہوا ان کا کوئی کسی پر	باہم ملامت کرتے ہوئے

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ	اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾	عَسٰى رَبُّنَآ	اَنْ يُّبْدِلَنَا
انہوں نے کہا ہائے ہماری بربادی	ہم تھے حد سے بڑھنے والے	امید ہے ہمارے رب سے	کہ وہ بدلے میں دے ہم کو

خَيْرًا مِّنْهَآ	اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا	رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾	كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ
زیادہ بھلا اس (باغ) سے	بیشک ہم اپنے رب کی طرف	رغبت کرنے والے ہیں	ایسا ہوتا ہے (دنیوی) عذاب

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ	اَكْبَرُ	لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ؏ ۝۳۳ 6892
اور یقیناً آخرت کا عذاب (تو)	سب سے بڑا ہے	کاش یہ لوگ جانتے ہوتے

نوٹ:1

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ میں ضمیر هُمْ کا مرجع ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہوں گے جن کا کردار اوپر زیر بحث آیا ہے۔ یہ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ وہ کردار کسی معین شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا ہے، ورنہ جمع کی جگہ واحد ضمیر آتی۔ اسی طرح یہاں زبان کا ایک دوسرا نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ یہاں لفظ اَلْجَنَّةِ پر الف لام داخل ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص باغ والوں کی طرف اشارہ ہے۔لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ تمثیلات میں لام تعریف یا اَلَّذِيْ اور اَلَّتِيْ وغیر جو آتے ہیں تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ کوئی معین ذات مدنظر ہے بلکہ اس سے مقصود صرف صورتِ حال کو مُشَخَّص و مُصَوَّر کرنا ہوتا ہے تا کہ قاری کے سامنے واقعہ کی پوری تفصیل آ جائے۔ اس وجہ سے یہاں کسی خاص باغ کے مالکوں کی جستجو کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک خاکہ ہے جس میں قریش کے لیڈروں کے ذہن اور ان کے انجام کی تصویر اس طرح کھینچ دی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رہ گیا ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

لَا يَسْتَثْنُوْنَ کے معنی استثناء نہ کرنے کے ہیں اور مراد اس استثناء سے ان شاء اللہ کہنا ہے۔اور بعض حضرات مفسرین نے استثناء سے مراد یہ لیا ہے کہ ہم پورا پورا غلہ اور پھل لے آئیں گے اور فقراء کا حصہ مستثنیٰ نہیں کریں گے۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (34 تا 43)

ترکیب

قاعدہ یہ ہے کہ جملہ کے شروع میں اِنَّ (بیشک) آتا ہے۔اور جملہ کے درمیان میں اَنَّ (کہ) آتا ہے۔ اس قاعدے کا ایک استثناء ہم آیت۔2/البقرۃ:25،نوٹ۔2۔ میں پڑھ چکے ہیں کہ قَالَ یا اس کے مشتقات سے شروع ہونے والے جملوں کے درمیان میں اِنَّ آتا ہے لیکن ایسی صورت میں اس کے معنیٰ ''کہ'' ہوتے ہیں۔اس قاعدے کا دوسرا استثناء یہ ہے کہ اَنَّ کی خبر پر اگر لام تاکید آ رہا ہو تو اس کی جگہ اِنَّ آتا ہے لیکن اس کے معنی اَنَّ (کہ) کے ہی ہوتے ہیں۔اس حوالہ سے نوٹ کریں کہ آیت۔38۔39 میں لَمَا میں مَا پر لام تاکید آیا ہے اس لیے ان سے پہلے اِنَّ آیا ہے لیکن ان کے معنی ''کہ'' ہی ہیں۔ تَخَيَّرُوْنَ اگر باب تفعیل سے ہوتا تو تُخَيِّرُوْنَ آتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ باب تفعل سے تَتَخَيَّرُوْنَ ہے جس کی ایک تا گری ہوئی ہے۔ (آیت۔43) اَبْصَارُهُمْ جمع مکسر ہے اس لیے خَاشِعَةً مؤنث کا صیغہ آیا ہے اور یہ حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ	جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۳۴	اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ
بیشک متقی لوگوں کے لیے ان کے رب کے پاس	دائمی نعمتوں کے باغات ہیں	تو کیا ہم بنائیں گے فرمانبرداروں کو

كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝۳۵	مَا لَكُمْ	كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝۳۶	اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ
مجرموں کے جیسا	تمہیں کیا ہے	کیسا تم لوگ فیصلہ کرتے ہو	یا تمہارے لیے کوئی ایسی (آسمانی) کتاب ہے

فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝۳۷	اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ	لَمَا	تَخَيَّرُوْنَ ۝۳۸
جس میں تم سبق پڑھتے ہو	کہ تمہارے لیے اس (کتاب) میں	ضرور وہ ہے جو	تم لوگ اپنے لیے پسند کرتے ہو

اَمۡ لَكُمۡ اَيۡمَانٌ عَلَيۡنَا	بَالِغَةٌ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۙ	اِنَّ لَكُمۡ	لَمَا	تَحۡكُمُوۡنَ ﴿۳۹﴾
یا تمہارے لیے ہم پر ایسی قسمیں ہیں جو	پہنچنے والی ہیں قیامت کے دن تک	کہ تمہارے لیے	ضرور وہ ہوگا جو	تم لوگ آڈر دو گے

سَلۡهُمۡ اَيُّهُمۡ	بِذٰلِكَ زَعِيۡمٌ ﴿۴۰﴾	اَمۡ لَهُمۡ شُرَكَآءُ	فَلۡيَاۡتُوۡا بِشُرَكَآئِهِمۡ
آپؐ پوچھیں ان سے کہ ان کا کون	اس کی ضمانت دینے والا ہے	یا ان کے لیے کچھ شریک ہیں	تو چاہیے کہ وہ آئیں اپنے شریکوں کے ساتھ

اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ﴿۴۱﴾	يَوۡمَ يُكۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ	وَّيُدۡعَوۡنَ اِلَى السُّجُوۡدِ
اگر وہ لوگ سچے ہیں	جس دن پردہ اٹھایا جائے گا پنڈلی سے	اور ان کو بلایا جائے گا سجدہ کرنے کی طرف

فَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ۙ﴿۴۲﴾	خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ	تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ ؕ
تو وہ استطاعت نہ رکھتے ہوں گے	جھکی پڑیں گی ان کی نظریں	چھا جائے گی ان پر ذلت

وَقَدۡ كَانُوۡا يُدۡعَوۡنَ	اِلَى السُّجُوۡدِ	وَهُمۡ سٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾
حالانکہ وہ بلائے گئے تھے	سجدہ کرنے کی طرف	اس حال میں کہ وہ صحیح سالم تھے

نوٹ: 1

ان آیات میں نیک بندوں کی جزاء کا ذکر ہے اور اس کے بعد مشرکین کے ایک اور باطل دعوے کا رَدّ ہے۔ کفار مکہ کہا کرتے تھے کہ اول تو قیامت آنے والی نہیں ہے اور دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب کا قصہ سب افسانہ ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو ہمیں وہاں بھی ایسی ہی نعمتیں ملیں گی جیسے دنیا میں ملی ہیں۔ اس کا جواب دیا گیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نیک بندوں اور مجرموں کو برابر کر دے گا۔ یہ کیسا عجیب وغریب فیصلہ ہے جس کی نہ کوئی سند نہ دلیل نہ کسی آسمانی کتاب سے اس کا ثبوت اور نہ ہی اللہ کی طرف سے کوئی وعدہ وعید کہ وہاں بھی تمہیں نعمت دے گا۔

ان آیات کے مذکورہ طرز استدلال سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کا آنا حساب کتاب کا ہونا اور نیک و بد کی جزاء وسزا، یہ سب عقلاً ضروری ہے (یعنی انسانی عقل اس کا تقاضہ کرتی ہے) دنیا میں ہر شخص اس کا مشاہدہ کرتا ہے اور کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا میں عموماً بدکار اور ظالم نفع میں رہتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔ پھر وہ نہ خوف خدا کو جانیں، نہ آخرت کو مانیں، نہ کسی شرم وحیا کے پابند ہوں اور اپنے نفس کی خواہشات کو جس طرح چاہیں پورا کرتے ہیں جبکہ نیک آدمی اوّل تو خدا سے ڈرتا ہے اور اگر وہ نہ ہو تو برادری کی شرم وحیات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دنیا کے کارخانے میں تو بدکار اور بدمعاش کامیاب اور نیک شریف آدمی ناکام نظر آتا ہے۔ اب اگر آگے بھی کوئی ایسا وقت نہ آئے جس میں حق اور ناحق کا صحیح انصاف ہو، نیک کو اچھا بدلہ ملے اور بد کو سزا ملے تو پھر اوّل تو کسی برائی کو برائی کہنا لغو اور بے معنیٰ ہو جاتا ہے اور دوم یہ کہ پھر عدل وانصاف کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ جو لوگ خدا کے وجود کے قائل ہیں وہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ خدا تعالیٰ کا انصاف کہاں گیا۔

رہا یہ خیال کہ دنیا میں مجرم پکڑا جاتا ہے اور سزا پاتا ہے۔ اس طرح شریف آدمی کا امتیاز اسی دنیا میں واضح ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف حکومتوں کے قوانین سے قائم ہو جاتا ہے (تو پھر دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب اور جزاء وسزا کی کیا ضرورت ہے۔ مرتب) یہ اس لیے غلط ہے کہ اوّل تو ہر جگہ اور ہر حال میں حکومت کی نگرانی ہو ہی نہیں سکتی، جہاں ہو جاوے وہاں عدالتی ثبوت ہر جگہ بہم پہنچانا آسان نہیں اور

جہاں ثبوت بھی بہم پہنچ جائے تو زور وزر اور رشوت وسفارش اور دباؤ کے کتنے چور دروازے ہیں جن سے مجرم نکل بھاگتا ہے۔ اس دنیا کی حکومتی اور عدالتی جرم وسزا کا جائزہ لیا جائے تو یہاں پر سزا صرف وہ بے عقل اور بے سہارا آدمی پاتا ہے جو کوئی چور دروازہ نہ نکال سکے۔ باقی سب مجرم آزاد پھرتے ہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ عقلاً ایک ایسا وقت آنا ضروری ہے جب سب کا حساب ہو اور جہاں مجرموں کے لیے چور دروازہ نہ ہو۔ (معارف القرآن)۔ 6892

نوٹ:2

آیت۔42۔ میں یُکۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ کے الفاظ کے متعلق صحابہ کرامؓ اور تابعین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ محاورے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ عربی محاورے کے مطابق سخت وقت آ پڑنے کو کشفِ ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک اور قول کے مطابق اس میں کشفِ ساق سے مراد حقائق پر سے پردہ اٹھانا لیا گیا ہے۔ اس تاویل کی رو سے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی اور لوگوں کے اعمال کھل کر سامنے آ جائیں گے اور قیامت کے دن اس بات کا مظاہرہ کرایا جائے گا کہ دنیا میں کون اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا تھا اور کون اس سے منحرف تھا۔ اس غرض کے لیے لوگوں کو بلایا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ بجالائیں۔ جو لوگ دنیا میں عبادت گزار تھے وہ سج دہ ریز ہو جائیں گے اور جنہوں نے دنیا میں اللہ کے آگے سر نیاز جھکانے سے انکار کیا تھا ان کی کمر تختہ ہو جائے گی اور ان کے لیے یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہاں عبادت گزار ہونے کا جھوٹا مظاہرہ کر سکیں۔ (تفہیم القرآن)۔

استادِ محترم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب مرحوم نے کشفِ ساق کے محاورے کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ عرب کے لوگوں کا لباس ٹخنوں تک ہوتا ہے۔ جب کوئی دشمن حملہ آور ہوتا تھا یا ڈاکو آ جاتے تھے تو یہ لوگ اپنے کپڑے گھٹنوں کے اوپر باندھ کر لڑنے کے لیے یا بھاگنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اس طرح کشف ساق کے محاورے میں کسی کام کے لیے تیار ہو جانے کا مفہوم ہے۔ حافظ صاحب کی اس وضاحت سے ذہن اردو محاورے کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے اردو میں ہم کہتے ہیں، کسی کام کے لیے کمر کس لینا۔ بہر حال حافظ صاحب کی وضاحت کے مطابق اس آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ جس دن دوبارہ زندہ کر کے اللہ کے حضور پیش کرنے کے لیے لوگوں کو تیار کیا جائے گا اور اس تیاری کا پہلا مرحلہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ اس وقت دو قومی نظریہ کھل کر سامنے آ جائے گا۔

آیت نمبر (44 تا 52)

ترجمہ

فَذَرۡنِیۡ	وَمَنۡ یُّکَذِّبُ	بِهٰذَا الۡحَدِیۡثِ ؕ	سَنَسۡتَدۡرِجُهُمۡ
تو آپ چھوڑ دیں مجھ کو	اور اس کو جو جھٹلاتا ہے	اِس بات (قرآن) کو	ہم بتدریج لے جائیں گے ان کو (خسران میں)

مِّنۡ حَیۡثُ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۴﴾	وَاُمۡلِیۡ لَهُمۡ ؕ	اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ ﴿۴۵﴾
جہاں سے یہ لوگ جانتے نہیں ہیں	اور میں ڈھیل دیتا ہوں ان کو	بیشک میری تدبیر بڑی پکی ہے

اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا	فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ	مُّثۡقَلُوۡنَ ﴿۴۶﴾	اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَیۡبُ
یا آپؐ مانگتے ہیں ان سے کوئی اجرت	تو وہ تاوان سے	لدے ہوئے ہیں	یا ان کے پاس غیب (کی خبر) ہے

فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾	فَاصْبِرْ	لِحُكْمِ رَبِّكَ	وَلَا تَكُنْ	كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ
تو وہ لوگ لکھتے ہیں	تو آپؐ ثابت قدم (منتظر) رہیں	اپنے رب کے حکم کے	اور آپؐ مت ہوں	مچھلی والے (یونسؑ) کی طرح

اِذْ نَادٰى	وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ ؕ	لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ	نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ
جب انہوںؑ نے پکارا (رب کو)	اس حال میں کہ وہ غم زدہ تھے	اگر نہ ہوتا کہ آلیاانؑ کو	ایک نعمت نے ان کے رب (کے پاس) سے

لَنُبِذَ	بِالْعَرَآءِ	وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾
تو ضرور وہ پھینکے گئے رہتے	اُس چٹیل میدان میں	اس حال میں کہ وہ مذمت کیے ہوئے ہوتے

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ	فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾	وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	لَيُزْلِقُوْنَكَ
پھر نوازاانؑ کو ان کے رب نے	تو اس نے کر دیاانؑ کو نیک لوگوں میں سے	اور بیشک ایسے لگتا ہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا	کہ وہ ضرور پھسلا دیں آپؐ کو

بِاَبْصَارِهِمْ	لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ	وَيَقُوْلُوْنَ
اپنی (غضبناک) نظروں سے	جب وہ سنتے ہیں اس یاددہانی (قرآن) کو	اور وہ لوگ کہتے ہیں

اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ ۘ	وَمَا هُوَ	اِلَّا ذِكْرٌ	لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾ ع
بیشک یہ ضرور مجنون ہے	حالانکہ نہیں ہے وہ	سوائے ایک ایسی یاددہانی ہے جو	تمام جہانوں کے لیے ہے

نوٹ: 1

آیت۔44۔ میں ہے کہ آپؐ جھٹلانے والوں کو اور مجھے چھوڑ دیں۔ یہاں چھوڑنا ایک محاورہ کے طور پر فرمایا گیا ہے۔ مراد اس سے اللہ پر بھروسہ کرنا ہے۔ اور اس کا حاصل کلام یہ ہے کہ کفار کی طرف سے یہ مطالبہ بھی پیش ہوا کرتا تھا کہ اگر ہم واقعی اللہ کے مجرم ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب دینے پر قادر ہے تو پھر ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ اس پر یہ فرمایا گیا کہ اپنی حکمت کو ہم خوب جانتے ہیں۔ ایک حد تک مہلت دیتے ہیں اور فوراً عذاب نہیں بھیج دیتے۔ پھر حضرت یونسؑ کے واقعہ کا ذکر فرما کر آنحضرت ﷺ کو نصیحت فرمائی کہ آپؐ ان لوگوں کے ایسے مطالبہ سے مغلوب نہ ہوں اور ان پر جلدی عذاب نازل کرنے کے خواہشمند نہ ہوں۔ اپنی حکمتوں، مصلحتوں کو ہم ہی جانتے ہیں۔ ہم پر توکل کریں۔ (معارف القرآن)۔

بے خبری میں بتدریج کسی کو تباہی کی طرف لے جانے کی صورت یہ ہے کہ ایک حق کے دشمن اور ظالم کو دنیا میں نعمتوں سے نوازا جائے، صحت، مال، اور دنیوی کامیابیاں عطا کی جائیں۔ جن سے دھوکا کھا کر وہ سمجھے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں خوب کر رہا ہوں۔ اس طرح وہ ظلم وطغیان میں زیادہ سے زیادہ غرق ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ جو نعمتیں اسے مل رہی ہیں وہ انعام نہیں ہیں بلکہ اس کی ہلاکت کا سامان ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل ایمان میں سے کسی کو اگر اللہ تعالیٰ دنیوی کامیابیوں اور یہاں کی نعمتوں سے نوازتا ہے تو یہ اس کا انعام ہیں۔ قرآن مجید میں کم از کم دو مقامات، الانفال۔28۔ اور التغابن۔15، میں براہِ راست اہل ایمان کو خطاب کر کے خبردار کیا گیا ہے کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد یعنی دنیا کی نعمتیں فتنہ یعنی آزمائش ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جو ان آزمائشوں میں پورا اترے گا تو یہ دنیوی نعمتیں اس کی آخرت کی کامیابیوں اور انعام کا ذریعہ بن جائیں گی، ناکامی کی صورت میں یہی نعمتیں آخرت میں ناکامی اور خسارے کا باعث ہوں گی۔ (مرتب)

نوٹ:2

آیت۔49۔کوسورۂ الصّافات کی آیت۔142۔146 کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ 6892 میں ڈالے گئے تھے اس وقت تو وہ ملامت میں مبتلا تھے،لیکن جب انہوں نے اللہ کی تسبیح کی اور اپنے قصور کا اعتراف کرلیا تو اگرچہ وہ مچھلی کے پیٹ سے نکال کر بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینکے گئے تھے،مگر وہ اس وقت مذمت میں مبتلا نہ تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس جگہ ایک بیلدار درخت اگا دیا، تا کہ اس کے پتے ان پر سایہ کریں اور وہ اس کے پھل سے اپنی بھوک پیاس بھی دور کرسکیں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔51۔کا تعلق بھی صبر وثبات کی تلقین کے اس مضمون ہی سے ہے جو فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ میں بیان ہوا ہے۔یعنی اگرچہ حالات نہایت سخت ہیں کہ کفار جب قرآن سنتے ہیں تو تمہیں اس طرح گھورتے ہیں جیسے وہ اپنی نگاہوں کے زور سے تمہیں دھکیل کر تمہارے مقام سے تم کو پھسلا دیں گے اور جوش غضب میں تمہیں خبطی اور مجنون بتاتے ہیں لیکن ان کے اس رویہ کے باوجود تم اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ یہاں ابتدائے سورہ کی آیت مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ، ذہن میں تازہ کر لیجئے۔سورہ جس مضمون سے شروع ہوئی تھی اسی پر ختم ہو رہی ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:4

آیات۔51۔52 کے ضمن میں کچھ مفسرین نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔انسان کی نظر بد لگ جانا اور اس سے کسی انسان کو نقصان اور بیماری بلکہ ہلاکت تک پہنچ جانا حقیقت ہے اور احادیث میں اس کا حق ہونا وارد ہے۔ یہ بات عرب میں بھی معروف ومشہور تھی اور مکہ میں ایک شخص نظر لگانے میں بڑا مشہور تھا۔اونٹوں یا جانوروں کو نظر لگا دیتا تو وہ ہلاک ہو جاتے۔کفارِ مکہ کو رسول اللہ ﷺ سے عداوت تو تھی ہی اور وہ آپ کو ایذاء پہنچانے کی ہر طرح کی کوشش کیا کرتے تھے۔ان کو یہ سوجھی کہ اُس شخص سے رسول اللہ ﷺ کو نظر لگواؤ۔تو لوگ اس کو بلا لائے۔اس نے نظر بد لگانے کی اپنی پوری کوشش کر لی مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی حفاظت فرمائی۔ یہ آیات اسی سلسلہ میں نازل ہوئیں اور لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ میں اسی نگاہ بد لگانے کو بیان فرمایا گیا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ جس شخص کو کسی انسان کی نظر بد لگ گئی ہو اس پر یہ آیات پڑھ کر دم کر دینا اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔(معارف القرآن)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الحاقۃ (69)

آیت نمبر (1 تا 12)

ح	س	م

(ض) حَسْمًا کسی چیز کو جڑ سے کاٹ دینا

حُسُوْمٌ صفت ہے۔نامبارک۔منحوس۔زیر مطالعہ آیت۔7

ص ر ع

6892

(ف) صَرْعًا زمین پر پٹخ دینا۔ پچھاڑنا

صَرِیْعٌ ج صَرْعٰی ۔ فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت ہے اسم المفعول کے معنی میں۔ پٹخا ہوا۔ پچھاڑا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت۔7

ترجمہ

اَلْحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾	مَا الْحَآقَّةُ ۚ﴿۲﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ﴿۳﴾
وہ ثابت ہونے والی	کیا ہے وہ ثابت ہونے والی	اور تم کیا جانو کیا ہے وہ ثابت ہونے والی (قیامت)

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ	بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾	فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا	بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾
جھٹلایا ثمود نے اور عاد نے	اس کھٹکھٹانے والی (قیامت) کو	پس وہ جو ثمود تھے تو ان کو ہلاک کیا گیا	حد سے گزرنے والی (چنگھاڑ) سے

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا	بِرِيْحٍ	صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ﴿۶﴾	سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ
اور وہ جو عاد تھے تو ان کو ہلاک کیا گیا	ایک ایسی ہوا سے جو	حد سے زیادہ تیز و تند تھی	اس (اللہ) نے مطیع (مسلط) کیا اس (ہوا) کو ان لوگوں پر

سَبْعَ لَيَالٍ	وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ	حُسُوْمًا ۙ	فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا	صَرْعٰى ۙ
سات راتوں	اور آٹھ دنوں تک	منحوس ہوتے ہوئے	پس تو دیکھتا ہے اُس قوم کو اُس (سرزمین) میں	پچھاڑے ہوئے

كَاَنَّهُمْ	اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ﴿۷﴾	فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ	مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴿۸﴾
جیسے کہ وہ ہوں	کچھ اوندھی ہونے والی کھجوروں کے تنے	تو کیا تو دیکھتا ہے ان لوگوں کی	کوئی بھی باقی رہنے والی (جان)

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ	وَالْمُؤْتَفِكٰتُ	بِالْخَاطِئَةِ ۚ﴿۹﴾	فَعَصَوْا
اور آیا فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے	اور الٹنے والی بستیوں (والے)	(ہر ایک) خطا کرنے والی (جان) کے ساتھ	پھر ان لوگوں نے نافرمانی کی

رَسُوْلَ رَبِّهِمْ	فَاَخَذَهُمْ	اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾	اِنَّا لَمَّا
اپنے رب کے رسول کی	تو اس نے پکڑا ان کو	ایک اٹھنے والی (شدید) پکڑ میں	بیشک ہم نے، اس وقت جب

طَغَا الْمَآءُ	حَمَلْنٰكُمْ	فِي الْجَارِيَةِ ۙ﴿۱۱﴾
جوش میں آیا پانی	سوار کیا تم لوگوں کو	اُس جاری ہونے والی (کشتی) میں

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ	تَذْكِرَةً	وَّتَعِيَهَآ	اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾
تاکہ ہم بنائیں اس (کشتی) کو تمہارے لیے	ایک یاددہانی	اور تاکہ یاد رکھے اس کو	کوئی یاد رکھنے والا کان

نوٹ: 1 سابقہ سورہ القلم سے اس سورہ کو گہری مناسبت ہے۔ دونوں کا عمود (یعنی مرکزی موضوع) ایک ہی ہے یعنی اثبات عذاب (دنیا میں آنے والے عذاب) اور قیامت (دنیا کا خاتمہ)۔ البتہ نہج استدلال دونوں میں الگ الگ ہے۔ قرآن کی عظمت وصداقت جس طرح سابق سورہ میں واضح کی گئی ہے اور اس کی تکذیب کے نتائج سے ڈرایا گیا ہے، اسی طرح اس سورہ میں بھی یہی مضمون زیر بحث آیا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ سابق سورہ

میں یہ مضمون تمہید کی حیثیت سے ہے اور اس سورہ میں اختتام کے طور پر ہے۔ تذکیر و تعلیم کے پہلو سے ان دونوں اسلوبوں کی اہمیت الگ الگ ہے۔ (تدبر قرآن)۔ 6892

نوٹ: 2

کفار مکہ چونکہ قیامت کو جھٹلا رہے تھے اور اس کے آنے کی خبر کو مذاق سمجھتے تھے اس لیے پہلے ان کو خبردار کیا گیا کہ وہ تو ہونی شدنی ہے، تم چاہے مانو یا نہ مانو، وہ بہرحال آ کر رہے گی۔ اس کے بعد ان کو بتایا گیا کہ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ کوئی شخص ایک پیش آنے والے واقعہ کی خبر کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں، بلکہ اس کا نہایت گہرا تعلق قوموں کے اخلاق اور پھر ان کے مستقبل سے ہے۔ تم سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے بھی آخرت کا انکار کر کے اسی دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھا اور اس بات کو جھٹلا دیا کہ انسان کو آخر کار خدا کی عدالت میں اپنا حساب دینا ہوگا، وہ سخت اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہوئی، یہاں تک کہ خدا کے عذاب نے آ کر دنیا کو اس کے وجود سے پاک کر دیا۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (13 تا 37)

و ھ ی

(ض۔ح) وَهْيًا — کسی چیز کا بوسیدہ ہو کر پھٹ جانا۔ شگاف پڑنا۔ بوسیدہ ہونا۔

وَاهِيَةٌ — مؤنث وَاهِيَةٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ پھٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔16۔

ق ط ف

(ض) قَطْفًا — پھل چننا۔

قِطْفٌ — ج قُطُوْفٌ۔ اسم ذات ہے۔ پھل۔ میوہ۔ زیر مطالعہ آیت۔33۔

ح ض ض

(ن) حَضًّا — کسی کام پر اکسانا۔ ترغیب دینا۔ زیر مطالعہ آیت۔34۔

(تفاعل) تَحَاضًّا — ایک دوسرے کو ترغیب دینا۔ ﴿وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۙ﴾ (89/الفجر:18) ''اور تم لوگ باہم ترغیب نہیں دیتے مسکین کے کھانا (کھلانے) پر۔ تَحٰضُّوْنَ دراصل تَتَحَاضُّوْنَ ہے جس کی ایک تا گری ہوئی ہے۔

ترکیب

(آیت۔13) آگے قیامت کے واقعات کا ذکر ہے اس لیے بھی (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:27) اور بات اِذَا شرطیہ سے شروع ہو رہی ہے، اس لیے بھی آگے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ نُفِخَ کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے نَفْخَةٌ حالت رفع میں ہے۔ (آیت۔14) دُكَّتَا تثنیہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ اس کا نائب فاعل اس میں شامل هُمَا کی ضمیر ہے جو اَلْاَرْضُ وَالْجِبَالُ کے لیے ہے اور محلاً حالت رفع میں ہے۔ دَكَّةً اس کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ (آیت۔17) وَالْمَلَكُ پر الف لام کو لام تعریف بھی مانا جا سکتا ہے اور لامِ جنس بھی۔ ترجمے میں ہم لام جنس کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔18) ثلاثی مجرد اور باب افعال، دونوں کا مضارع مجہول ہم شکل ہو جاتا ہے۔ عبارت کا سیاق و سباق بتا رہے کہ یہاں تُعْرَضُوْنَ باب افعال کا نہیں بلکہ ثلاثی مجرد کا مضارع مجہول ہے۔ خَفِيَ کے

ساتھ صلہ کے استعمال سے مفہوم بدلتا ہے۔ خَفِيَ عَلَيْهِ (پوشیدہ ہوا اس پر یعنی اس سے پوشیدہ ہوا۔) خَفِيَ مِنْهُ۔ (پوشیدہ ہوا اس سے یعنی اس کا کوئی کام پوشیدہ ہوا) ترجمہ کرتے وقت اردو محاورے کا لحاظ کرنا ہوگا (آیت۔19) اُوْتِيَ کا نائب فاعل مَنْ ہے جو محلاً حالتِ رفع میں ہے، جبکہ كِتٰبَهٗ میں كِتٰبُ مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ كِتٰبِيَهْ دراصل كِتَابِيْ ہے جس پر ہائے سکت لگی ہوئی ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/البقرة 259، نوٹ۔2)۔ اسی طرح آگے حِسَابِيَهْ۔ مَالِيَهْ۔ سُلْطٰنِيَهْ وغیرہ میں بھی یائے متکلم کے آگے ہائے سکت لگی ہے۔ نوٹ کرلیں کہ تائے تانیث پر جب وقف کرتے ہیں تو وہ بھی ہا کی آواز دیتی ہے لیکن کتابت میں اس پر تا کے دو نقطے آتے ہیں جیسے رَاضِيَةٍ۔ عَالِيَةٍ۔ دَانِيَةٌ۔ اَلْقَاضِيَةَ وغیرہ۔ جب کہ ہائے سکت نقطوں سے خالی ہوتی ہے۔ (آیت۔27) كَانَتْ کا اسم اس میں شامل هِيَ کی ضمیر ہے جب کہ اَلْقَاضِيَةَ اس کی خبر ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ	نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾	وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ
پھر جب پھونکا جائے گا صور میں	ایک ہی بار پھونکنا	اور اٹھائی جائے گی یہ زمین اور سارے پہاڑ

فَدُكَّتَا	دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾	فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ	الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾	وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ
پھر وہ دونوں کوٹ کر ہموار کیے جائیں گے	ایک ہی بار ہموار کرنا	تو اُس دن واقع ہوگی	وہ واقع ہونے والی (قیامت)	اور پھٹ جائے گا آسمان

فَهِيَ يَوْمَئِذٍ	وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾	وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا	وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ
تو وہ (آسمان) اُس دن	بوسیدہ ہوگا	اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے	اور اٹھائیں گے تیرے رب کا عرش

فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ	ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾	يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ	لَا تَخْفٰى	مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿۱۸﴾
اپنے اوپر اس دن	آٹھ (فرشتے)	اس دن تم لوگ سامنے لائے جاؤ گے	چھپی نہیں ہوگی	تمہاری کوئی چھپنے والی (بات)

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ	كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ	فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ	اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿۱۹﴾	اِنِّيْ ظَنَنْتُ
پس وہ جو ہے جس کو دی گئی	اس کی کتاب اس کے داہنے ہاتھ میں	تو وہ کہے گا یہ لو	پڑھو میری کتاب	بیشک میں نے خیال کیا

اَنِّيْ مُلٰقٍ	حِسَابِيَهْ ﴿۲۰﴾	فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴿۲۱﴾	فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿۲۲﴾
کہ میں ملاقات کرنے والا ہوں	اپنے حساب سے	تو وہ من بھاتی زندگی گزارنے میں ہے	اونچا ہونے والے باغ میں

قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ﴿۲۳﴾	كُلُوْا وَاشْرَبُوْا	هَنِيْٓــًٔا	بِمَآ اَسْلَفْتُمْ
جس کے میوے قریب ہونے والے (جھکے ہوئے) ہوں گے	(کہا جائے گا) تم لوگ کھاؤ اور پیو	خوشگوار ہوتے ہوئے	بسبب اس کے جو تم لوگوں نے آگے بھیجا

فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۲۴﴾	وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ	كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ	فَيَقُوْلُ
گزرنے والے دنوں میں	اور وہ جو ہے جس کو دی گئی	اس کی کتاب اس کے بائیں ہاتھ میں	تو وہ کہے گا

يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ	كِتٰبِيَهْ ﴿۲۵﴾	وَلَمْ اَدْرِ	مَا حِسَابِيَهْ ﴿۲۶﴾	يٰلَيْتَهَا كَانَتِ
اے کاش مجھ کو دی ہی نہ جاتی	میری کتاب	اور میں جانتا ہی نہ	کیا ہے میرا حساب	اے کاش وہ (موت ہی) ہوتی

الْقَاضِيَةَ ﴿۲۷﴾	مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ	مَالِيَهْ ﴿۲۸﴾	هَلَكَ عَنِّيْ	سُلْطٰنِيَهْ ﴿۲۹﴾
فیصلہ کرنے (قصہ چکانے) والی	کیا کام آیا میرے	میرا مال	ہلاک (زائل) ہوا مجھ سے	میرا اختیار

خُذُوْهُ	فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾	ثُمَّ الْجَحِيْمَ	صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾	ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ
(کہا جائے گا) پکڑو اس کو	پھر طوق پہناؤ اس کو	پھر دہکتی آگ میں	تم لوگ بھونو اس کو	پھر ایک ایسی زنجیر میں

ذَرْعُهَا	سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا	فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾	اِنَّهٗ	كَانَ لَا يُؤْمِنُ
جس کی لمبائی	ستر ہاتھ ہے	تم لوگ ڈالو (جکڑو) اس کو	بیشک وہ	ایمان نہیں لاتا تھا

بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿۳۳﴾	وَلَا يَحُضُّ	عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳۴﴾	فَلَيْسَ لَهُ
اس عظیم اللہ پر	اور ترغیب نہیں دیتا تھا (کسی کو)	مسکین کے کھانا (کھلانے) پر	تو نہیں ہے اس کے لیے

الْيَوْمَ هٰهُنَا	حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾	وَّلَا طَعَامٌ	اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾	لَّا يَاْكُلُهٗٓ	اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ﴿۳۷﴾
آج یہاں	کوئی گرم جوش (دوست)	اور نہ چکھنے کی کوئی چیز	سوائے زخموں کے میل کچیل میں سے	نہیں کھاتے اس کو مگر	خطا (گناہ) کرنے والے

نوٹ: 1

زیر مطالعہ آیات کو پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں ہونی چاہیے کہ قرآن مجید میں کہیں تو قیامت کے تین مراحل الگ الگ بیان کیے گئے ہیں جو یکے بعد دیگرے مختلف اوقات میں پیش آئیں گے۔ اور کہیں پہلے مرحلے سے آخری مرحلے تک کے واقعات کو سمیٹ کر یکجا کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نمل آیت۔ 87۔ میں پہلے نَفَخِ صور کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب تمام دنیا کے انسان یک لخت ایک ہولناک آواز سے گھبرا اٹھیں گے۔ اس وقت نظام عالم کے درہم برہم ہونے کی وہ کیفیات ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آئیں گی جو سورۂ حج آیات۔ 1، 2، سورۂ یٰسین آیات۔ 49۔ 50، اور سورۂ تکویر آیات۔ 1 تا 6 میں بیان ہوئی ہیں۔ سورۂ زمر آیات۔ 67 تا 70۔ میں دوسرے اور تیسرے نَفَخِ صور کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک نفخ پر سب لوگ مر کر گر جائیں گے اور اس کے بعد جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب جی اٹھیں گے اور خدا کی عدالت میں پیش ہو جائیں گے۔ سورۂ طٰہٰ آیات۔ 102 تا 112، سورۂ انبیاء آیات۔ 101 تا 103، سورۂ یٰسین آیات۔ 51 تا 53، اور سورۂ ق آیات۔ 20 تا 22 میں صرف تیسرے نَفَخِ صور کا ذکر ہے۔ لیکن یہاں اور دوسرے مقامات پر قرآن میں پہلے نَفَخِ صور سے لے کر جنت اور جہنم میں لوگوں کے داخل ہونے تک کے تمام واقعات کو ایک ہی سلسلہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

قرآن مجید میں قیامت کے جو احوال بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق متشابہات سے ہے۔ ہمارے فہم سے قریب لانے کے لیے ان کو ایسے لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے جن سے ان کا ایک تصور ہمارے ذہن میں قائم ہو سکے۔ یہ احوال ایک نادیدہ عالم کے ہیں، ان کا تصور دینے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ان کی اصل حقیقت کا جاننا اس عالم میں ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے متعلق یہ ہدایت دی ہے کہ وہ جس طرح بیان ہوئے ہیں، اسی طرح ان پر اجمالی ایمان رکھا جائے۔ ان کی اصل حقیقت کے درپے نہ ہوا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ آدمی کسی فتنہ میں پڑ جائے۔ (تدبر قرآن)۔

قیامت کے روز عرش رحمٰن کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے تو یہ کام

چار فرشتوں کے سپرد ہے۔ قیامت کے روز ان کے ساتھ چار اور بڑھا دیئے جائیں گے۔ رہا یہ معاملہ کہ عرش رحمٰن کیا چیز ہے اور اس کی حقیقت 6892 اور شکل وصورت کیا ہے اور فرشتوں کا اس کو اٹھانا کس صورت سے ہے، یہ سب چیزیں وہ ہیں کہ عقل انسانی ان کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ ان مباحث میں پڑنے، ان پر غور وفکر کرنے اور سوالات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ صحابہ اور تابعین کا مسلک اس جیسے تمام معاملات میں یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے کہ اس سے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق ہے اور اس کی حقیقت وکیفیت نامعلوم ہے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3

سیدھے ہاتھ میں نامۂ اعمال کا دیا جانا ہی ظاہر کر دے گا کہ اس کا حساب بے باق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے نہیں بلکہ صالح انسان کی حیثیت سے پیش ہو رہا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ اعمال ناموں کی تقسیم کے وقت صالح انسان خود سیدھا ہاتھ بڑھا کر اپنا نامۂ اعمال لے گا، کیونکہ موت کے وقت سے میدان حشر میں حاضری تک اس کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا ہوگا اس کی وجہ سے اس کو پہلے ہی یہ اطمینان حاصل ہو چکا ہوگا کہ میں یہاں انعام پانے کے لیے پیش ہو رہا ہوں نہ کہ سزا پانے کے لیے۔ قرآن مجید میں یہ بات جگہ جگہ بڑی صراحت کے ساتھ بتائی گئی ہے کہ موت کے وقت ہی سے یہ بات انسان پر واضح ہو جاتی ہے کہ وہ نیک بخت آدمی کی حیثیت سے دوسرے عالم میں جا رہا ہے یا بد بخت آدمی کی حیثیت سے۔ پھر موت سے قیامت تک نیک انسان کے ساتھ مہمان کا سا معاملہ ہوتا ہے اور بد انسان کے ساتھ حوالاتی مجرم کا سا۔ اس کے بعد جب قیامت کے روز دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے اسی وقت سے صالحین کی حالت وکیفیت کچھ اور ہوتی ہے جبکہ کفار، منافقین اور مجرمین کی کچھ اور۔

سورۂ انشقاق میں فرمایا گیا ہے ''اور جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا'' غالباً اس کی صورت یہ ہوگی کہ مجرم کو چونکہ پہلے ہی سے اپنے مجرم ہونے کا علم ہوگا اور وہ جانتا ہوگا کہ اس کے نامۂ اعمال میں اس کا سارا کچا چٹھا درج ہے اس لیے وہ نہایت بے دلی کے ساتھ اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر اسے لے گا اور فوراً پیٹھ کے پیچھے چھپا لے گا تا کہ کوئی دوسرا اسے دیکھنے نہ پائے۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (36 تا 43)

و ت ن

وُتُوْنًا — پانی کا ہمیشہ بہنا اور نہ رکنا۔

وَتِیْنٌ — فَعِیْلٌ کا وزن ہے لیکن یہ اسم ذات ہے۔ دل کی رگ جس سے تمام رگوں میں خون جاتا ہے۔ زیر مطالعہ آیت۔46۔

ترکیب

آیت۔45) اس میں یہ نہیں کہا کہ لَاَخَذْنَاہُ بلکہ ضمیر مفعولی کے ساتھ مِنْ لگا دیا ہے کیونکہ کسی کو جب پکڑتے ہیں تو اس کا پورا جسم نہیں پکڑتے بلکہ جسم کا کوئی حصہ جیسے گردن یا ہاتھ وغیرہ پکڑتے ہیں۔ بالیمین (داہنے ہاتھ سے)۔ اس سے مراد ہے قوت سے۔ طاقت سے۔ (حافظ احمد یار صاحب کے کیسٹ سے ماخوذ)۔ اس آیت کے ترجمہ سے متعلق تدبر قرآن میں ہے کہ عام طور پر لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے ''ہم اس کا (پیغمبر کا) داہنا ہاتھ پکڑتے'' لیکن عربیت کے قاعدے سے اس کا ترجمہ ہونا چاہیے ''ہم اس کو اپنے قوی بازو سے پکڑتے۔'' اور تفسیر ابن جریر سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ (آیت۔47) لفظ اَحَدٌ میں کبھی جمع کا مفہوم ہوتا ہے۔ جیسے ہم کہیں کہ تم لوگوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم سب کے سب ایسے نہیں ہو۔ اس طرح اس جملہ میں لفظ ایک جمع کے مفہوم میں ہے۔ اس آیت میں بھی مِنْ اَحَدٍ جمع کے مفہوم میں ہے، اس لیے حَاجِزًا (واحد) کے بجائے حَاجِزِیْنَ (جمع) آیا ہے۔

ترجمہ

1892

فَلَآ	اُقۡسِمُ	بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۸﴾	وَمَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾	اِنَّهٗ
پس نہیں!	میں قسم کھاتا ہوں	اس کی جو تم لوگ دیکھتے ہو	اور اس کی جو تم لوگ نہیں دیکھتے	بیشک یہ (قرآن)

لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ﴿۴۰﴾	وَّمَا هُوَ	بِقَوۡلِ شَاعِرٍ	قَلِيۡلًا مَّا	تُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۱﴾
یقیناً ایک بزرگ رسول کا کہا ہوا ہے	اور یہ (قرآن)	کسی شاعر کا کہا ہوا نہیں ہے	بہت ہی تھوڑا سا	تم لوگ ایمان لاتے ہو

وَلَا بِقَوۡلِ كَاهِنٍ	قَلِيۡلًا مَّا	تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۴۲﴾	تَنۡزِيۡلٌ	مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۳﴾
اور نہ کسی کاہن کا کہا ہوا ہے	بہت ہی تھوڑی سی	تم لوگ نصیحت پکڑتے ہو	(یہ) اتارا ہوا ہے	تمام جہانوں کے رب (کی طرف) سے

وَلَوۡ تَقَوَّلَ عَلَيۡنَا	بَعۡضَ الۡاَقَاوِيۡلِ ﴿۴۴﴾	لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ	بِالۡيَمِيۡنِ ﴿۴۵﴾
اور اگر وہ غلط منسوب کرتے ہم پر	باتوں کی کوئی (بات)	تو ہم ضرور پکڑتے اس کو	داہنے ہاتھ (پوری طاقت) سے

ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ	الۡوَتِيۡنَ ﴿۴۶﴾	فَمَا مِنۡكُمۡ	مِّنۡ اَحَدٍ	عَنۡهُ حٰجِزِيۡنَ ﴿۴۷﴾
پھر ہم ضرور کاٹ دیتے اس سے	(اس کی) رگِ دل کو	تو نہ ہوتا تم میں سے	کوئی ایک بھی	اس سے روکنے والا

وَاِنَّهٗ لَتَذۡكِرَةٌ	لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۸﴾	وَاِنَّا لَنَعۡلَمُ	اَنَّ مِنۡكُمۡ
اور بیشک یہ (قرآن) یقیناً ایک یاددہانی ہے	متقی لوگوں کے لیے	اور بیشک ہم یقیناً جانتے ہیں	کہ تم میں سے

مُّكَذِّبِيۡنَ ﴿۴۹﴾	وَاِنَّهٗ	لَحَسۡرَةٌ	عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۵۰﴾
کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں (اس کو)	اور بیشک یہ (جھٹلانا) ضرور	ایک حسرت ہوگا	انکار کرنے والوں پر

وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الۡيَقِيۡنِ ﴿۵۱﴾	فَسَبِّحۡ	بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ ﴿۵۲﴾ ع
اور بیشک یہ یقین کرنے کا حقدار ہے	تو پھر تو تسبیح کر	اپنے عظیم رب کے نام کی

نوٹ:1

قسم سے پہلے اس طرح جو لاَ آیا کرتا ہے وہ نہ تو زائد ہوتا ہے اور نہ قسم کی نفی کے لیے، بلکہ یہ قسم سے پہلے مخاطب کی بات کی تردید کے لیے آتا ہے۔ قرآن میں جہاں کوئی قسم کھائی گئی ہے بالعموم دعوے کی شہادت اور اس کی دلیل کے طور پر کھائی گئی ہے۔ یہاں اصل دعویٰ اثباتِ جزاء و سزا ہے۔ قیامت اور جزاء وسزا پر قرآن نے جو دلائل دیے ہیں وہ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکے ہیں اور اس سورہ میں بھی زیرِ بحث آئے ہیں۔ ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کا تعلق آفاق وانفس کے ان شواہد سے بھی ہے جو آنکھوں سے دیکھے جاسکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات اور آخرت کے ان احوال سے بھی ہے جو آنکھوں سے تو نہیں دیکھے جاسکتی لیکن عقل سے سمجھے جاسکتے ہیں۔ اسی سورہ میں جزاء وسزا پر جو دلیل قائم کی گئی ہے وہ پہلے قوموں کی تاریخ اور ان کی تباہی کے آثار سے قائم کی گئی ہے۔ پھر عالم غیب کے وہ احوال سنائے گئے ہیں جن سے اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کو سابقہ پیش آنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک کا تعلق اس عالم سے ہے جس کی گواہی تاریخ کے صفحات اور زمین کے آثار میں موجود ہے۔ اور دوسرے کا تعلق اس نادیدہ عالم سے ہے جس کو ہر چند یہاں آنکھوں سے تو نہیں دیکھا جاسکتا لیکن عقل اس کو تسلیم

کرتی ہے کیونکہ خالق کی صفات اور اس جہاں میں پیش آنے والے مکافاتِ عمل کے واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔1892 انہی دوطرح کی دلیلوں کو گواہی میں پیش کر کے منکروں کو آگاہ فرمایا ہے کہ قرآن جس جزاء وسزا سے تمہیں آگاہ کررہا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔اس عالم مشہود اور عالم غیر مشہود کے دلائل اس کی تائید میں ہیں۔اس کو کسی شاعر کا کلام قرار دے کر جھٹلانے کی کوشش مت کرو۔(تدبر قرآن)۔

نوٹ:2 آیت۔40 میں رسول کریم سے مراد محمد ﷺ ہیں اور سورۂ تکویر (آیت۔19) میں اس سے مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔اس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں قرآن کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں ہے۔ظاہر ہے کہ کفار مکہ جبریلؑ کو نہیں بلکہ محمد ﷺ کو شاعر اور کاہن کہتے تھے جبکہ سورۂ تکویر میں قرآن کو رسول کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول بڑی قوت والا ہے، صاحب عرش کے ہاں بلند مرتبہ ہے، وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے اور محمد ﷺ نے اس کو روشن افق پر دیکھا ہے۔قریب قریب یہی مضمون سورۂ نجم کی آیات۔5 تا10 میں حضرت جبریلؑ کے متعلق بیان ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کو محمد ﷺ اور جبریلؑ کا قول کس معنی میں کہا گیا ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ اس کو حضورؐ کی زبان سے اور حضور ﷺ اسے جبریلؑ کی زبان سے سن رہے تھے۔اس لیے ایک لحاظ سے یہ حضور ﷺ کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے جبریلؑ کا قول، لیکن آگے چل کر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ فی الاصل یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔خود رسول کا لفظ بھی اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان دونوں کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ پیغامبر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اس کو پیغام بھیجنے والے کی طرف سے پیش کیا ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3 آیات۔44 تا47 میں ایک خاص واقعہ کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اگر خدانخواستہ معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے تو آپ ﷺ کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا۔اس میں کوئی عام ضابطہ بیان نہیں کیا گیا کہ جو شخص بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے، ہمیشہ اس کو ہلاک ہی کر دیا جائے گا۔یہی وجہ ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا لیکن ان پر کوئی ایسا عذاب نہیں آیا۔(معارف القرآن)۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ جس طرح بادشاہ ایک شخص کو کسی منصب پر مامور کر کے اور سند وفرمان وغیرہ دے کر کسی طرف روانہ کرتے ہیں۔اب اگر اس شخص سے اُس خدمت میں کچھ خیانت ہوئی یا بادشاہ پر کچھ جھوٹ باندھنا اس سے ثابت ہوا تو اسی وقت بلا توقف اس کا تدارک کرتے ہیں۔لیکن اگر سڑک کوٹنے والا مزدور یا جھاڑو دینے والا بھنگی بکتا پھرے کہ گورنمنٹ کا میرے لیے یہ فرمان ہے یا میرے ذریعہ سے یہ احکام دیئے گئے ہیں، تو کون اس کی بات پر کان دھرتا ہے اور کون اس کے دعوؤں سے تعرض کرتا ہے۔بہر حال آیت ہذا میں حضور ﷺ کی نبوت پر استدلال نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ بتلایا گیا ہے کہ قرآن کریم خالص اللہ کا کلام ہے جس میں ایک حرف یا ایک شوشہ بھی نبی کریم ﷺ اپنی طرف سے شامل نہیں کر سکتے اور نہ آپ ﷺ کی یہ شان ہے کہ کوئی بات اللہ کی طرف منسوب کر دیں جو اس نے نہ کی ہو۔تورات سفر استثناء کے اٹھارویں باب میں بیسواں فقرہ یہ ہے، لیکن وہ نبی ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ ہی قتل کیا جائے۔'' (ترجمہ شیخ الہند)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6892

سورۃ المعارج (70)

آیت نمبر (1 تا 18)

ع ھ ن

(ض) عَھۡنًا شاخ کا لچکنا اور ٹوٹنے کے قریب ہونا۔
عِھۡنٌ رنگی ہوئی اون۔ آیت۔ زیر مطالعہ۔ ۹۔

ل ظ ی

(س) لَظًّی آگ کا بھڑکنا۔
لَظٰی آگ کا شعلہ جہنم کا اسم علم بھی ہے۔ زیر مطالعہ آیت۔ 15۔
(تفعل) تَلَظُّیًا غصّہ سے جل اٹھنا۔ ﴿فَاَنۡذَرۡتُکُمۡ نَارًا تَلَظّٰی ۚ﴾ (92/اللیل:14) ''تو میں نے خبردار کر دیا تم لوگوں کو ایک ایسی آگ سے جو غصّہ سے جل اٹھے گی۔''

ترکیب

(آیت۔2) لَیۡسَ لَہٗ میں ہٗ کی ضمیر بِعَذَابٍ کے لیے ہے۔ (آیت۔3) مِنَ اللّٰہِ کا تعلق دَافِعٌ سے بھی مانا جا سکتا ہے۔ اس وقت معنی ہوں گے کہ اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا اور اس کا تعلق بِعَذَابٍ سے بھی مانا جا سکتا ہے۔ اس وقت معنی ہوں گے کہ وہ عذاب اللہ کی طرف سے واقع ہونے والا ہے۔ مِنَ اللّٰہِ سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے دَافِعٌ سے اس کا متعلق ہونا قابل ترجیح تھا لیکن آگے کی عبارت کا تقاضہ ہے کہ اس کو بِعَذَابٍ سے متعلق مانا جائے۔ (آیت۔6۔7) یَرَوۡنَہٗ اور نَرٰىہُ دونوں کی ضمیر مفعولی یَوۡمٍ کے لیے ہے جس سے مراد عَذَابٌ وَاقِعٌ والا دن یعنی قیامت ہے۔ (آیت۔ 11) بَصَّرَ (باب تفعیل) کے دو مفعول آتے ہیں۔ کس کو دکھایا اور کیا دکھایا۔ یہاں اس کا مضارع مجہول آیا ہے۔ یُبَصَّرُوۡنَ میں شامل ھُمۡ کی ضمیر اس کا مفعولِ اوّل ہے جو اب نائب فاعل کہلائے گا اور یہ ضمیر حَمِیۡمٌ کے لیے ہے۔ اس کے آگے ھُمۡ کی ضمیر مفعولی اس کے مفعول ثانی کے لیے ہے۔ یہ ضمیر حَمِیۡمًا کے لیے ہے۔

ترجمہ

سَاَلَ سَآئِلٌۢ	بِعَذَابٍ	وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾	لِّلۡکٰفِرِیۡنَ لَیۡسَ لَہٗ	دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾
مانگا ایک مانگنے والے نے	ایک ایسا عذاب جو	واقع ہونے والا ہے	کافروں کے لیے نہیں ہے جس کو	کوئی دفع کرنے والا

مِّنَ اللّٰہِ ذِی الۡمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾	تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَالرُّوۡحُ
جو بلندیوں والے اللہ (کی طرف) سے ہوگا	چڑھیں گے فرشتے اور الروح (جبریلؑ)

اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ	کَانَ مِقۡدَارُہٗ	خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَۃٍ ۚ﴿۴﴾	فَاصۡبِرۡ صَبۡرًا جَمِیۡلًا ﴿۵﴾
اس کی طرف ایک ایسے دن میں	ہے جس کے اندازے کا پیمانہ	پچاس ہزار سال ہے	تو آپ صبر کریں جیسے خوبصورت صبر کرنا ہوتا ہے

اِنَّہُمۡ یَرَوۡنَہٗ بَعِیۡدًا ۙ﴿۶﴾	وَّنَرٰىہُ قَرِیۡبًا ؕ﴿۷﴾	یَوۡمَ تَکُوۡنُ السَّمَآءُ	کَالۡمُہۡلِ ۙ﴿۸﴾
بیشک وہ لوگ دیکھتے ہیں اس (قیامت) کو دور ہوتے ہوئے	اور ہم دیکھتے ہیں اس کو قریب	جس دن ہو جائے گا آسمان	پگھلی ہوئی دھات کی مانند

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ	كَالْعِهْنِ ۝٩	وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ	حَمِيْمًا ۝١٠
اور ہو جائیں گے پہاڑ	رنگی ہوئی اون کی مانند	اور نہیں پوچھے گا کوئی دوست	کسی دوست سے (خیر خیریت)

يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ	يَوَدُّ الْمُجْرِمُ	لَوْ يَفْتَدِيْ
ان (دوستوں) کو دکھائے جائیں گے وہ سب (دوست)	تمنا کریں گے سارے مجرم	کاش وہ خود کو چھڑا لیں

مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ	بِبَنِيْهِ ۝١١	وَصَاحِبَتِهٖ	وَاَخِيْهِ ۝١٢
اس دن کے عذاب سے	بدلے میں دے کر اپنے بیٹے کو	اور اپنی ساتھ والی (بیوی) کو	اور اپنے بھائی کو

وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ	تُـْٔوِيْهِ ۝١٣	وَمَنْ فِي الْاَرْضِ	جَمِيْعًا ۙ
اور اپنے اُس کنبے کو جو	ٹھکانہ دیتا تھا اس کو	اور ان کو جو زمین میں ہیں	سب کے سب کو

ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝١٤	كَلَّا ؕ	اِنَّهَا لَظٰى ۝١٥	نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝١٦
پھر وہ (فدیہ دینا) نجات دلائے اس کو	ہرگز نہیں	بیشک یہ آگ کی تپش ہے	اُدھیڑنے والی ہوتے ہوئے چمڑی کو

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ	وَتَوَلّٰى ۝١٧	وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝١٨
وہ (تپش) بلائے گی اس کو جس نے پیٹھ پھیری	اور روگردانی کی	اور جمع کیا (مال) پھر محفوظ رکھا

نوٹ: 1

ایک دن کا ایک ہزار سال یا پچاس ہزار سال کے برابر ہونے کا کیا مفہوم ہے، اس کی ایک وضاحت آیت نمبر۔22/47، نوٹ۔2۔ میں کی جا چکی ہے جبکہ ہمارے طلباء کے علم میں یہ بات بھی ہونی چاہیے کہ ہمارے مفسرین نے ان آیات کو کس طرح سمجھا ہے اور ان کی کیا وضاحت کی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ہم مفسرین کی رائے نقل کر رہے ہیں

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ عذاب جس کا اوپر ذکر آیا ہے، اس کا وقوع اس روز ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے متعلق سوال کیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہو گی کہ یہ دن کتنا دراز ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ یہ دن مومن پر اتنا ہلکا ہوگا کہ ایک نماز فرض ادا کرنے کے وقت سے بھی کم ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ یہ دن مومنین کے لیے اتنا ہوگا جتنا ظہر و عصر کے درمیان ہوتا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ اس دن کا یہ طول کہ پچاس ہزار سال کا ہوگا، ایک اضافی امر ہے، کہ کفار کے لیے اتنا دراز اور مومنوں کے لیے اتنا مختصر ہوتا۔

اس آیت میں ایک دن کی مقدار پچاس ہزار سال بتائی ہے، جبکہ سورۂ السجدہ کی آیت۔5 میں ایک ہزار سال آئے ہیں۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے ''تدبیر کرتے ہیں امر الٰہی کی آسمان سے زمین تک۔ پھر چڑھتے ہیں اس کی طرف ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے عام شمار کے اعتبار سے۔'' بظاہر ان دونوں آیتوں کے مضمون میں تضاد ہے۔ اس کا جواب گزشتہ روایات حدیث سے ہو گیا کہ اس دن کا طول مختلف گروہوں کے اعتبار سے مختلف ہوگا۔ کفار کے لیے پچاس ہزار سال کا اور مومنین صالحین کے لیے ایک نماز کا وقت۔ ان کے درمیان مختلف گروہ ہیں۔ ممکن ہے بعض کے لیے ایک ہزار سال کے برابر ہو۔ اور وقت کا دراز و مختصر ہونا۔ شدت و بے چینی اور عیش و آرام میں مختلف ہونا، مشہور و معروف ہے۔

سورۂ السجدہ کی جس آیت میں ایک ہزار سال کا دن بیان کیا گیا ہے، اس کی ایک توجیہہ تفسیر مظہری میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس آیت میں جس دن کا ذکر ہے وہ دنیا ہی کے دنوں کا ایک دن ہے، اس میں جبریلؑ اور فرشتوں کا آسمان سے زمین پر آنا پھر زمین سے آسمان پر واپس جانا اتنی بڑی مسافت کو طے کرتا ہے کہ انسان اگر طے کرتا تو اس کو ایک ہزار سال لگتے کیونکہ احادیث میں آیا ہے کہ آسمان سے زمین تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اس طرح پانچ سو سال اوپر سے نیچے آنے کے اور پانچ سو واپس جانے کے، یہ کل ایک ہزار سال انسانی چال کے اعتبار سے ہیں۔ بالفرض اگر انسان اس مسافت کو طے کرتا تو آنے اور جانے میں ایک ہزار سال لگ جاتے۔ اگرچہ فرشتے اس مسافت کو بہت ہی مختصر وقت میں طے کر لیتے ہیں۔ تو سورۂ سجدہ میں دنیا ہی کے دنوں میں سے ایک دن کا بیان ہوا اور سورۂ معارف میں قیامت کے دن کا بیان ہے جو ایام دنیا سے بہت بڑا ہوگا اور اس کی درازی اور کوتاہی مختلف لوگوں پر اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے مختلف محسوس ہوگی۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (19 تا 35)

ھ	ل	ع

(س) هُلْعًا گھبرانا۔ مشکل میں صبر نہ کرنا۔ بے صبرا ہونا۔
هُلُوْعٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت گھبرانے والا۔ ذرا بھی صبر نہ کرنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔19۔

ترکیب

(آیات۔19 تا 21) هَلُوْعًا۔ جَزُوْعًا۔ مَنُوْعًا، یہ تینوں فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغے ہیں اور حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ (آیت۔22) اصول یہ ہے کہ جمع میں سے واحد کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن واحد میں سے جمع کو مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اس آیت میں اَلْمُصَلِّيْنَ جمع ہے جس کو اَلْاِنْسَانَ میں سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اَلْاِنْسَانَ پر لام تعریف نہیں بلکہ لامِ جنس ہے۔ (آیت۔28) اٰمِنَ، یَاْمَنُ کے معروف معنی ہیں ''امن میں ہونا''۔ اس معنی میں یہ فعل لازم ہے جس کا مفعول مَاْمُوْنٌ نہیں آتا۔ لیکن نوٹ کریں کہ آیت۔2/البقرۃ:3) کی لغت میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس کے دوسرے معنی ''بھروسہ کرنا۔ اعتبار کرنا'' بھی ہیں۔ اس معنی میں یہ متعدی ہے اور مَاْمُوْنٌ کا لفظ اسی معنیٰ میں آتا ہے۔ (آیت۔35) جَنّٰتٍ حالت جر میں ہے۔ مُكْرَمُوْنَ اگر جَنّٰتٍ کی صفت ہوتا تو صیغہ مؤنث کا ہوتا اور حالتِ جرّ میں ہوتا لیکن یہ حالت رفع میں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اُولٰٓئِكَ کی خبر ہے۔

ترجمہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ	هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾	اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ	جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾
بیشک تمام انسان پیدا کیے گئے	بڑے بے صبرے	جب کبھی چھوتی ہے کسی کو برائی	تو واویلا کرنے والا ہے

وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ	مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾	اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾
اور جب کبھی چھوتی ہے کسی کو بھلائی	تو بہت کنجوسی کرنے والا ہے	سوائے ان نماز پڑھنے والوں کے

الَّذِيْنَ	هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ	دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾	وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ	حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾
جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی نماز پر	ہمیشہ (متوجہ) رہنے والے ہیں	اور وہ لوگ جن کے مالوں میں	ایک معلوم (مقرر کردہ) حق ہے

لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾	وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ	بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾
مانگنے والے اور محروم کے لیے	اور وہ لوگ جو تصدیق کرتے ہیں	بدلے کے دن کی

وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ	مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾	اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ
اور وہ جو ہیں کہ وہ اپنے رب کے عذاب سے	ڈرنے والے ہیں	بیشک ان کے رب کا عذاب

غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾	وَالَّذِيْنَ	هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾	اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ
بھروسہ کیا ہوا (کے قابل) نہیں ہے	اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی	حفاظت کرنے والے ہیں	سوائے اپنی بیویوں کے

اَوْ مَا مَلَكَتْ	اَيْمَانُهُمْ	فَاِنَّهُمْ	غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾	فَمَنِ ابْتَغٰى
یا جن کے مالک ہوئے	ان کے داہنے ہاتھ	تو بیشک وہ لوگ	ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں	پھر جس نے جستجو کی

وَرَآءَ ذٰلِكَ	فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾	وَالَّذِيْنَ	هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ
اس کے علاوہ کی	تو وہ لوگ ہی حد سے بڑھنے والے ہیں	اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی امانتوں کی

وَعَهْدِهِمْ	رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾	وَالَّذِيْنَ	هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ	قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾
اور اپنے قول وقرار کی	نگرانی کرنے والے ہیں	اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی گواہیوں پر	ڈٹے رہنے والے ہیں

وَالَّذِيْنَ	هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ	يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾	اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ	مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾
اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی نماز پر	مسلسل پہرہ دیتے ہیں	وہ لوگ باغوں میں	عزت دیئے ہوئے ہوں گے

نوٹ: 1

جس بات کو ہم اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں کہ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے کہ انسان ایسا پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت مواقع پر نوع انسان کی عام اخلاقی کمزوریوں کا ذکر کرنے کے بعد ایمان لانے والے اور راہ راست اختیار کرنے والے لوگوں کو ان سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی مضمون آگے کی آیات میں بھی آرہا ہے۔ اس سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پیدائشی کمزوریاں ایسی نہیں ہیں کہ ان کو تبدیل نہ کیا جا سکے۔ بلکہ انسان اگر خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اپنے نفس کی اصلاح کی کوشش کرے تو وہ ان کو دور کر سکتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو متضاد داعیات کی کشمکش میں پیدا کر کے اس سے یہ چاہا ہے کہ وہ خدا کے احکام کے مطابق جن کی تعلیم اس کو نبیوں کی ذریعہ سے دی گئی ہے، ان کے اندر توازن اور ہم آہنگی پیدا کرے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے قوانین کا تابع بنائے۔ اس

امتحان میں کامیابی پر ہی انسان کی تمام اُخری سعادت کا انحصار ہے۔ اختیار کا شرف بھی اس کو اس امتحان کے لیے عطا ہوا ہے۔ 6892 یہ امتحان مقصود نہ ہوتا تو انسان کو اختیار کے شرف سے مشرف کرنے کے کوئی معنی نہ ہوتے اور اس کو دوسری مخلوقات پر برتری حاصل کرنے کی بھی کوئی وجہ نہ ہوتی۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 2

زیر مطالعہ آیات ہمہ جہت (Multi Dimentional) ہیں۔ ان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے آپ کو تفاسیر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہماری زیادہ تر توجہ آیات کے اس پہلو پر مرتکز رہے گی جس کا تعلق بے صبری کے علاج سے یا جدید اصطلاح میں جذباتی بلوغت کے حصول سے ہے۔ کسی شخص کو اپنے جذبات پر جتنا کنٹرول حاصل ہے، اتنی ہی جذباتی بلوغت اس نے حاصل کر لی ہے اور کوئی شخص جس حد تک اپنے جذبات کے قابو میں ہے، اتنا ہی وہ جذباتی لحاظ سے نابالغ ہے۔ اب نوٹ کریں کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ جسمانی، ذہنی اور جذباتی، تینوں لحاظ سے نابالغ ہوتا ہے۔ پھر جسمانی اور ذہنی بلوغت حاصل کرنے میں جسم کے قدرتی نظام اور انسانی کوشش، دونوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ لیکن جب انسان سوچنے سمجھنے اور نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے تو اس کے بعد جذباتی بلوغت حاصل کرنے کا انحصار انسانی کوشش پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسمانی بلوغت تقریباً ہر شخص کو پندرہ سال کے لگ بھگ حاصل ہو جاتی ہے۔ ذہنی بلوغت کوئی شخص جتنی حاصل کر سکتا ہے، وہ تقریباً چالیس سال کی عمر تک حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن جذباتی بلوغت کے لیے نہ تو عمر کی کوئی قید ہے اور نہ ہی یہ ہر شخص کو نصیب ہوتی ہے۔ کچھ لوگ کم عمری میں ہی جذباتی لحاظ سے بالغ ہو جاتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ اس کے بغیر ہی زندگی گزار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جذباتی بلوغت کا تقریباً کل کا کل انحصار انسان کی اپنی کوشش اور مشق پر ہے۔

اس ضمن میں پہلے یہ سمجھ لیں کہ ''آخروی سعادت'' کے ساتھ ساتھ ہماری اس دنیا کی زندگی میں جذباتی بلوغت کی کیا اہمیت ہے۔ ماہرین نفسیات اب اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ذہانت کے ٹیسٹ (I.Q. Test) میں کسی کا زیادہ نمبر حاصل کر لینا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ ایسا شخص عملی زندگی میں بھی کامیاب رہے گا۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ زندگی کی کامیابی میں ذہانت کا حصہ صرف بیس فیصد ہے، جبکہ اسی فیصد انحصار دیگر عوامل پر ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم عامل کو جذباتی ذہانت (Emotional) کہا گیا ہے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ، مئی ۱۹۹۶ء)۔ اس اہمیت کے پیش نظر ہم جذبات پر کنٹرول حاصل کرنے کے طریقے آیات زیر مطالعہ سے سیکھنے کی کوشش کریں گے۔

جذباتی بلوغت حاصل کرنے کے لیے ان آیات میں جن صفات کا ذکر ہے، ان کی ابتداء بھی نماز کے ذکر سے ہوتی ہے اور ان کا اختتام بھی نماز کے ذکر پر ہوا ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ''نماز ہی سے تمام نیکیاں نشوونما بھی پاتی ہیں اور وہی اپنے حصار میں ان کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اگر نماز وجود میں نہ آئے تو دوسری نیکیاں بھی وجود میں نہیں آتیں۔'' (تدبر قرآن، ج ۵، ص ۳۰۰)۔ اس کورس، جینے کا سلیقہ حصہ اول میں نماز میں عمل خود تجویزی (Self Suggestion) کے نظام اور انسانی عمل پر اس کے اثرات کے متعلق جو کچھ آپ نے پڑھا ہے، اسے ذہن میں تازہ کر لیں تو پر آپ اس حقیقت کو قبول کر لیں گے کہ نماز تمام اچھی صلاحیتوں کی نرسری ہے۔ اب غور کریں کہ اس آیت میں پہلی صفت کے طور پر جو نماز کا ذکر آیا ہے، اس میں الفاظ کی بندش بہت معنی خیز ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جذباتی

بلوغت حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھنی چاہیے۔ نہ ہی یہ فرمایا کہ جولوگ نماز پڑھتے ہیں وہ اس نقص سے مستثنیٰ ہوجاتے ہیں بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس سے ایسے نمازی مستثنیٰ ہیں جو اپنی نماز پر ''دائم'' ہوتے ہیں۔ ''حضرت عتبہ بن عامرؓ سے نماز میں دائم رہنے کا مطلب پوچھا گیا کہ کیا اس کی مراد یہ ہے کہ جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ نہیں یہ مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جو اول سے آخر تک اپنی نماز کی طرف متوجہ رہے۔''۔(معارف القرآن)۔ 6892

اب دیکھیں ایک نمازی دن میں پانچ مرتبہ اور نماز کی ہر رکعت میں جب یہ کوشش کرتا ہے کہ غیر متعلق خیالات کو ذہن سے نکال کر وہ اپنی توجہ کو نماز پر مرکوز رکھے تو اس مسلسل مشق کی وجہ سے اس کی دو صلاحیتیں اُجاگر ہو کر پختہ ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ذہن میں غیر متعلق یا ناپسندیدہ خیالات کی موجودگی کا احساس ہو جانا۔ دوسرے یہ استعداد حاصل ہو جانا کہ انسان جس خیال کو چاہے ذہن سے جھٹک دے اور جس خیال کو چاہے ذہن میں رہنے دے۔ نماز میں یہ صلاحیتیں حاصل کر لینے کے بعد زندگی کے معاملات میں انہیں استعمال کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ اب یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ جذبات پر کنٹرول حاصل کرنے کی یہ شاہ کلید (Master Key) ہے، کیونکہ جیسے خیالات انسان کے ذہن میں ہوتے ہیں ویسے ہی جذبات اس کے اندر پروان چڑھتے ہیں۔

اس ضمن میں دوسری صفت یہ بیان ہوئی کہ سائل اور محروم کا حق ادا کرتے ہیں۔ اب نوٹ کریں کہ رزق کی مختلف اقسام میں سب سے قوی محبت مال کی محبت ہے۔ انفاق سے اس جذبہ کو کنٹرول کرنے کی مشق ہوتی ہے۔ اس پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد زندگی کے معاملات میں دیگر محبتوں اور رغبتوں پر کنٹرول حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

خیالات اور جذبات پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے جو طریقۂ کار اب تک سامنے آیا ہے اس پر عمل کرتے ہوئے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن خیالات کو غلط سمجھ کر ذہن سے نکالا جائے اور کن کو پروان چڑھایا جائے۔ اس سلسلہ میں درست فیصلہ کرنے میں، اصولی طور پر تو انسان کو کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہیے کیونکہ نیکی اور بدی کا شعور انسان کی فطرت میں ودیعت کر کے اسے دنیا کی امتحان گاہ میں بھیجا جاتا ہے۔ (سورۃ الشّمس۔8) لیکن یہاں آ کر اس کی فطرت پر خواہشات اور مفادات کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انسان بدلے کے دن یعنی آخرت کے حساب کتاب کے یقین اور اللہ کے عذاب کے خوف کے ساتھ غور و فکر کرے تو پھر یہ پردے ہٹ جائیں گے اور اس کی فطرت اس کی رہنمائی کرے گی۔ پھر اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہو گا کہ کون سے خیالات اور جذبات پسندیدہ ہیں اور کون سے ناپسندیدہ ہیں۔

اس کے بعد بتایا گیا کہ بے صبری کی کمزوری سے مستثنیٰ لوگوں کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ جنس کے معاملہ میں وہ آیا نظم وضبط (Sex Discipline) کے پابند ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانی جذبوں میں جنس کا جذبہ سب سے زیادہ پرکشش ہے۔ اس لیے جو شخص اس کو کنٹرول کر لے اس کے لیے باقی جذبوں کو کنٹرول کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ چنانچہ اس ضمن میں سب سے زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ جب بھی ذہن میں کوئی ایسا خیال آئے جو ایسے جنسی جذبے کو بیدار کرے جس کی اجازت نہیں ہے، تو اسے لازماً ذہن سے جھٹک کر ذہن کو دوسرے خیالات میں مصروف کرنے کی کوشش کرے۔ اس کوشش میں کامیابی کی استعداد حاصل کیے بغیر جنسی نظم وضبط کی پابندی کرنا بہت مشکل ہے۔

اس کے بعد اگلی صفت یہ بیان ہوئی کہ بے صبری سے مستثنیٰ لوگ اپنی امانتوں اور عہد کا پاس کرتے ہیں۔ اس میں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ واحد لفظ امانت کے بجائے اس کی جمع امانات استعمال کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امانت کی مختلف اقسام ہیں اور یہ لوگ ہر قسم کی امانت کا پاس کرتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ہمیں حواسِ خمسہ، عقل اور تفقہ کی جو صلاحیتیں دی ہیں، وہ سب امانت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب واپس مانگتا ہے تو دینا پڑتا ہے۔ اس لیے واپس نہ کرنے والی خیانت کی تو ہمیں قدرت ہی نہیں ہے۔ البتہ انہیں استعمال کرنے کی اجازت کچھ حدود و قیود کے ساتھ ملی ہے۔ جس نے ان کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں استعمال کیا اس نے امانت کا حق ادا کر دیا۔ جس نے ان کا لحاظ نہیں رکھا اس نے خیانت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں وارننگ دے دی ہے کہ ان سب صلاحیتوں (کے استعمال) کے متعلق ہم سے پوچھا جائے گا۔

(سورۂ بنی اسرائیل۔:36)۔ اس کے علاوہ ہمارے تمام مال و اسباب بھی اس پہلو سے امانت ہیں کہ انہیں حاصل کرنے کی بھی اور انہیں استعمال کرنے کی اجازت بھی حدود و قیود کے ساتھ ملی ہے۔ ان کے متعلق بھی قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ (سورۂ تکاثر۔8) اب یہ بات بہت واضح ہے کہ جذبات پر کنٹرل حاصل کیے بغیر ان امانتوں کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح عہد و پیمان میں وہ سارے معاہدے شامل ہیں جو انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان، انسان اور انسان کے درمیان یا قوم اور قوم کی درمیان استوار کیے گئے ہوں۔ معاہدے تحریری بھی ہوتے ہیں اور زبانی بھی، لیکن بہت سے معاہدے صرف Implied ہوتے ہیں جیسے والدین اور اولاد، استاد اور شاگرد وغیرہ کے حقوق و فرائض۔ اسی طرح اگلی آیت میں شہادت (گواہی) کے بجائے جمع کا صیغہ شہادات استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ شہادت کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر قسم کی شہادت کو قائم رکھنا واجب ہے۔ اس میں توحید و رسالت کی گواہی (کلمۂ شہادت) بھی شامل ہے، حدودِ شرعیہ کی شہادت بھی اور لوگوں کے باہمی معاملات جو کسی کے سامنے ہوئے ہوں، ان کی شہادت بھی۔ ان شہادتوں کو چھپانا اور ان میں کمی بیشی کرنا حرام ہے۔ ان کو صحیح صحیح قائم رکھنا اس آیت کی رو سے فرض ہے۔ (معارف القران)۔

رسول اللہ ﷺ نے مختلف پیرائے میں ہم کو جذباتی بلوغت حاصل کرنے کی تلقین کی ہے' ہم صرف دو ارشادات نقل کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کے طرزِ عمل کا تابع بنا کر مت رکھو۔ یہ کہنا غلط ہے۔ اگر لوگ بھلائی کریں گے تو ہم بھلائی کریں گے اور لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ تم لوگ اپنے نفس کو ایک قاعدے کا پابند بناؤ۔ اگر لوگ نیکی کریں تو تم لوگ نیکی کرو اور اگر لوگ بدسلوکی کریں تو تم لوگ ظلم نہ کرو۔ (تفہیم القرآن۔ ج2،ص456) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو React کرنے سے منع کیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ ان میں سے چار باتیں آپ ﷺ نے یہ فرمائیں کہ میں خواہ کسی سے خوش ہوں یا ناراض، ہر حالت میں انصاف کی بات کہوں۔ جو میرا حق مارے میں اس کا حق ادا کروں۔ جو مجھے محروم کرے میں اسے عطا کروں۔ اور جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو تجھ سے خیانت کرے، تو اس سے خیانت نہ کر۔ (تفہیم القرآن۔ ج2،ص456)۔ ایک طرف یہ اسی ہدایت کی تشریح ہے کہ تم لوگ اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کے طرزِ عمل کا تابع مت بناؤ۔ دوسری طرف یہ ایک بالغ شخصیت کا کردار ہے جس کا کامل نمونہ نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔

بات ختم کرنے سے پہلے ذہن میں یہ حقیقت واضح کر لیں کہ جسمانی اور ذہنی بلوغت سے شخصیت (Personality) بالغ نہیں ہوتی۔ بالغ شخصیت (Matured Personality) کے لیے جذباتی بلوغت ضروری ہے۔ (جینے کا سلیقہ حصہ چہارم صفحات 25 تا 37 سے ماخوذ)۔

آیت نمبر (36 تا 44)

6892

ع ز و

(ن) عَزْوًا منسوب ہونا۔ اپنے آپ کو دوسرے کی طرف منسوب کرنا۔ خواہ یہ سچ ہو یا جھوٹ۔

عِزَةٌ (یہ دراصل عِزْوٌ تھا۔ اس کی واؤ گری ہوئی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ لام کلمہ کا حرف علت کسی وجہ سے گراتے ہیں تو اس کی جگہ گول تا لگا دیتے ہیں۔ اس طرح یہ عِزَةٌ استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع عِزُوْن۔ عِزِیْنَ، آتی ہے)۔ اس کے معنی ہیں گروہ یا جماعت۔ لیکن یہ ایسی جماعت کے لیے آتا ہے جس کے افراد بلحاظ نسبت یا بلحاظ مدد و تعاون ایک دوسرے کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ زیر مطالعہ آیت۔ 37

و ف ض

X X ثلاثی مجرد سے فعل نہیں آتا۔

(افعال) اِیْفَاضًا تیز چلنا، دوڑنا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 44۔

ترکیب

(آیت۔36) فَمَالِ میں جو لام ہے یہ حروف جارّہ والا لام ہے اور اس کا تعلق فَمَا سے نہیں ہے بلکہ اَلَّذِیْنَ سے ہے۔ اصل عبارت یوں ہے۔ فَمَا لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔ چونکہ حرف جار لِ الگ لکھا گیا ہے اس لیے اَلَّذِیْنَ کا حمزہ الوصل واپس آ گیا ہے۔ اس آیت میں اس کو اس طرح لکھنا قرآن مجید کا مخصوص املا ہے۔ مُهْطِعِیْنَ اسم الفاعل ہے اور حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ (آیت۔42)۔ فَذَرْهُمْ میں ذَرْ فعل امر ہے۔ اس کا جواب امر ہونے کی وجہ سے یَخُوْضُوْا اور یَلْعَبُوْا مضارع مجزوم ہیں، جبکہ حَتّٰی کی وجہ سے یُلٰقُوْا مضارع منصوب ہے۔ (آیت۔44) خَاشِعَةً اسم الفاعل ہے اور حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ

فَمَا	لِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا	قِبَلَكَ	مُهْطِعِیْنَ ۝ۙ۳۶	عَنِ الْیَمِیْنِ
تو کیا ہے	ان کے لیے جنہوں نے انکار کیا	(آتے ہیں) آپ کی طرف	لپکنے (چڑھائی کرنے) والے ہوتے ہوئے	دائیں سے

وَعَنِ الشِّمَالِ	عِزِیْنَ ۝۳۷	اَیَطْمَعُ	کُلُّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ	اَنْ یُّدْخَلَ
اور بائیں سے	گروہ در گروہ ہوتے ہوئے	کیا امید رکھتا ہے	ہر ایک شخص ان میں سے	کہ وہ داخل کیا جائے گا

جَنَّةَ نَعِیْمٍ ۝ۙ۳۸	کَلَّا ط	اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ	مِّمَّا یَعْلَمُوْنَ ۝۳۹	فَلَآ
سدا بہاری کے باغ میں	ہرگز نہیں	بیشک ہم نے پیدا کیا ان کو	اس سے جسے یہ لوگ جانتے ہیں	پس نہیں!

اُقْسِمُ	بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ	اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝ۙ۴۰	عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ
میں قسم کھاتا ہوں	مشرقوں اور مغربوں کے رب کی	بیشک ہم یقیناً قدرت رکھنے والے ہیں	اس پر کہ ہم تبدیل کر دیں (ان کو)

خَیْرًا مِّنْهُمْ ۙ	وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ۝۴۱	فَذَرْهُمْ	یَخُوْضُوْا وَیَلْعَبُوْا
ان سے بہتر سے	اور ہم عاجز کیے ہوئے نہیں ہیں	تو آپ چھوڑ دیں ان کو	وہ بے پر کی اڑائیں اور کھیلیں کو دیں

حَتّٰى يُلٰقُوْا	يَوْمَهُمُ الَّذِىْ	يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾
یہاں تک کہ وہ ملاقات کریں	اپنے اس دن سے جس کا	ان سے وعدہ کیا جاتا ہے

يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ	مِنَ الْاَجْدَاثِ	سِرَاعًا	كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ
جس دن وہ لوگ نکلیں گے	قبروں سے	ایک دوسرے پر جلدی کرتے ہوئے	جیسے کہ وہ لوگ کسی استھان کی طرف

يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾	خَاشِعَةً	اَبْصَارُهُمْ	تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ
بھاگتے ہوں گے	جھکنے والی ہوں گی	ان کی آنکھیں	چھا جائے گی ان پر ذلت

ذٰلِكَ الْيَوْمُ	الَّذِىْ	كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾
یہ دن	وہ ہے جس کا	ان سے وعدہ کیا جاتا تھا

نوٹ: 1

سابقہ آیات۔ 19 تا 35۔ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس قسم کے لوگوں کو جنت میں جگہ ملے گی۔ قرآن کا یہ فیصلہ سن کر قریش کے مغروروں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ وہ یہ کس طرح سن سکتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے مفلوک الحال ساتھی تو جنت میں براجمان ہوں گے اور تمام عزتوں اور عظمتوں کے وارث، سادات قریش دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ اس غصہ میں وہ ٹولیاں بنا بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تردید توہین کے لیے دائیں بائیں سے آپؐ پل پڑتے۔ زیر مطالعہ آیات میں اسی صورتِ حال کی تصویر اور ان مغروروں کی خود باختگی پر اظہار تعجب ہے۔ (تدبر قرآن)۔

آیت۔ 38۔ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی جنت تو ان لوگوں کے لیے ہے جن کی صفات ابھی ابھی بیان کی جا چکی ہیں۔ اب کیا یہ لوگ جو حق بات سننا تک گوارہ نہیں کرتے اور حق کی آواز کو دبانے کے لیے دوڑے چلے آ رہے ہیں، جنت کے امیدوار ہو سکتے ہیں؟ کیا خدا نے اپنی جنت ایسے ہی لوگوں کے لیے بنائی ہے؟ اس مقام پر سورۃ القلم کی آیات۔ 34 تا 41 پیش نظر رکھنی چاہئیں جن میں کفار مکہ کو اُن کی اِس بات کا جواب دیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 2

آیت۔ 39۔ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ مضمونِ سابق کے ساتھ اس کا تعلق مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس مادے سے یہ لوگ بنے ہیں اس کے لحاظ سے تو سب انسان یکساں ہیں۔ اگر وہ مادہ ہی انسان کے جنت میں جانے کا سبب ہو تو نیک و بد، ظالم و عادل، مجرم اور بے گناہ، سب ہی کو جنت میں جانا چاہیے۔ لیکن معمولی عقل ہی یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ جنت کا استحقاق انسان کے مادۂ تخلیق کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اوصاف کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔ اور اگر اس فقرے کو بعد کے مضمون کی تمہید سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہمارے عذاب سے محفوظ سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ ہم ان کو دنیا میں بھی جب چاہیں عذاب دے سکتے ہیں اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے بھی جب چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔ یہ خود جانتے ہیں کہ نطفہ کی ایک حقیر سی بوند سے ان کی تخلیق کی ابتداء کر کے ہم نے ان کو چلتا پھرتا انسان بنایا ہے۔ اگر اپنی اس تخلیق پر یہ غور کرتے تو انہیں کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہوتی کہ ہم انہیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔40۔ میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔مشرقوں اور مغربوں کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ سال کے دوران میں سورج ہر روز ایک نئے زاویہ پر غروب ہوتا ہے۔ نیز زمین کے مختلف حصوں پر سورج الگ الگ اوقات میں پے در پے طلوع اور غروب ہوتا چلا جاتا ہے۔ان اعتبارات سے مشرق اور مغرب ایک نہیں ہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ایک دوسرے اعتبار سے شمال اور جنوب کے مقابلے میں ایک جنوب مشرق ہے اور دوسری جہت مغرب ہے۔ اس بنا پر سورۃ شعراء کی آیت۔28 اور سورہ مزمل کی آیت۔19 میں رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ایک اور لحاظ سے زمین کے دو مشرق اور دو مغرب ہیں کیونکہ جب زمین کے ایک نصف کرے پر سورج غروب ہوتا ہے تو دوسرے پر طلوع ہوتا ہے۔اس بنا پر سورۂ رحمن کی آیت۔17 رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ (تفہیم القرآن)۔